سعادت حسن منٹو



سرگذشتِ اسیر

سرگذشتِ اسیر —— ایک ناول

پھانسی

وکٹر ہیوگو کا شاہکار

مترجمہ

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور

ناشر . . . . نواز
مطبع . . . . مکتبہ نیّرہ شاہد لاہور
قیمت . . . . -/۱۰ روپے

انتساب

مجرم کی معصوم بچّی

میری کے نام

(مترجم)

مقدّمہ!

سرگذشتِ اسیر

فرانس کے مایۂ ناز بین الملّی شاعر، ادیب اور مفکر وکٹر ۱۸۸۵ ہیو گو" "VI CTORHUGO" کی ہستی محتاج تعارف نہیں۔ وہ اپنی لاثانی و غیر فانی تصنیف "مصیبت زدگان" یعنی LEISEDABLE SYS) اسے شہرت دوام حاصل کر چکا ہے۔ فی الحقیقت فرانسیسی انشا پرداز اپنے زمانہ (۱۸۸۵-۲-۲۰) میں فطرتِ انسانی کا بہترین ماہر تھا۔ سوسائٹی یعنی مجلسی دائرہ ــ کے پیدا کردہ عیوب اور اخلاقی تباہیوں سے وہ اس قدر متاثر ہوا۔ کہ اس کی ہر تصنیف اس چیز کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ وہ امراء کی تعیش پسندی کو نفرت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا۔ گرسنہ شکم اور برہنہ جسم غرباء کی حالت سے متاثر ہوتا۔ اس کے نزدیک تمام عیوب سوسائٹی کے پیدا کردہ ہیں۔ اور انسان جب سوسائٹی کی قیود سے آزاد ہونا چاہتا ہے تب سوسائٹی اپنے یک طرفہ غیر آئینی اور نا قابل قبول قوانین سے

اُسے مصائب اور نوائب میں اس خیال سے دھکیل دیتی ہے کہ اس کی اصلاح ہو۔ حالانکہ ایسا کرنے سے اصل اصلاح نہیں ہو سکتی۔

وہ غرباء کی منتہی اور غیر مختتم تکالیف سے متاثر ہو کر لکھتا ہے :-

"ترازوئے عدل کی طرف دیکھو۔ تمام مصائب غرباء کے لئے اور تمام مسرتیں امراء کے لئے۔ دونوں پلڑے غیر مساوی ہیں۔ ترازوئے عدل کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ اور نہ ہی حکومت کو اس دھوکہ دہی میں مدد کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے غرباء کے مصائب میں اضافہ ہوتا ہے۔

تم عدل وانصاف کو کام میں لاؤ۔ تاکہ غرباء کو معلوم ہو جائے۔ کہ اُن کے لئے نیلگوں آسمان کے نیچے کوئی جائے پناہ ہے۔ ایک رضی جنت ہے۔ جس کی لطیف فضاؤں سے وہ بھی متمتع ہو سکتا ہے۔ اس کا مرتبہ بلند کرو۔ تاکہ اسے بھی معلوم ہو کہ امراء کی تعیش پسندی میں وہ بھی برابر کا شریک ہے۔

جس چیز نے ہیوگو کے دماغ کو حد سے زائد پریشان کیا جس مسئلہ نے ہیوگو پر راتوں کی نیند حرام کر دی۔ جس قانون نے اس کے قلم کو اعجاز بخشا۔ وہ سزائے موت کا خونی فتویٰ تھا۔

اس کے نزدیک وہ کتاب قانون کا سیاہ ترین ورق تھا۔ جس میں متفقہ طور پر موت کی سزا کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ہیوگو فتوائے موت کو فرانسیسی مقننین کی عدل وانصاف کی رُو سے غداری بتاتا ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو دعوت مبارزت دیتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ ان کے پاس سزائے موت کے جواز میں جس قدر بھی دلائل و براہین ہیں۔ وہ اُن سے اسے آگاہ کریں۔ وہ لوگ جو سزائے موت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ دلائل پیش کرتے ہیں۔ کہ ایسے متنفس کا وجود جس نے مجلسی زندگی میں تلخی پیدا کی۔ قابلِ اخراج ہے۔ سب سے بہترین دلیل جو وہ پیش کرتے ہیں۔ وہ نظریہ

عبرت ہے۔ ہیوگو نظریۂ عبرت کے خلاف مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

" اگر ان مثالوں کی موجودگی میں بھی تم "نظریۂ عبرت کے قائل ہو۔ تو گردشِ ایام کا رخ ماضی کی طرف پھیر کر ہمیں سولھویں صدی عیسوی میں لے چلو۔ حقیقت میں خوفناک بن جاؤ ہمارے لئے تکالیف ومصائب کے دروازے کھول دو۔ ازمنہ عتیق کی بربری سزائیں از سرِ نو رائج کردو ہر راہگذار پر تختۂ دار کو نصب کردو۔ یہ نئی سزا کو عام کردو۔ پیرس کے بازاروں میں دیگر دوکانداروں کی طرح ایک دکان جلاد کی ہو۔ جہاں انسانی گوشت پوست دیگر اجناس کی طرح فروخت ہو فنا کو بادۂ ہر جام کرتے اور سزائے موت کو اس طرح عام کرنے سے تم نظریۂ عبرت کو زیادہ کامیاب بنا سکتے ہو"۔

ہیوگو تنسیخ سزائے موت کے معاشری اور مجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

میزانِ عقل میں بڑے بڑے جرم کو تولو تو تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ سوسائٹی کو اس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں جسے وہ عطا نہیں کر سکتی۔

جس انسان کیلئے تم موت کی سزا تجویز کرتے ہو۔ اسکی معاشری زندگی مندرجہ ذیل صورتوں میں ہو سکتی ہے۔

اوّلاً وہ شخص افرادِ خاندان اور صحبتِ احباب سے محروم ہے۔ اس صورت میں وہ صحیح تعلیم وتربیت حاصل نہیں کر سکا۔ جب اس کے دماغ کی اصلاح کیلئے کوئی سعی نہیں کی گئی تب تمہیں اس معاشری یتیم کے قتل کرنے کا کیا حق ہے ؟

تم اسے اس لئے قتل کرتے ہو۔ کہ اس کا عہدِ طفولیت عدم نگہداشت کی نظر ہوا۔ تم اسے اپنے کئے کی سزا دیتے ہو۔ تم اس بدبخت کو جرم کا لباس پہناتے ہو۔

کیا تم اس وقت خوفزدہ نہیں ہوتے۔ جب تم اس کے لڑکے اور لڑکیوں کا خیال کرتے ہو ——— ان بچوں کا جن سے زندگی کا سہارا چھین لیا گیا کیا تم محسوس نہیں کرتے۔ کہ آئندہ پندرہ برس میں بیٹا زندان میں ہوگا۔ اور بیٹی تعیش پسند

امراء کی نفسانی خواہش کے بہلانے کا ذریعہ ہوگی۔"

جس طرح ہیوگو نے غرباء کے مصائب سے متاثر ہو کر "مصیبت زدگان" لکھی ٹھیک اسی طرح سزائے موت کے مجرم کے اندرونی احساسات اور قلبی کیفیات سے اثر پذیر ہو کر اس نے ایک کتاب The last days of condemned لکھی۔

کتاب کا انداز تحریر پڑھنے والوں کے دماغ سے گذر کر اُن کے دل پر منقش ہو جاتا ہے۔ کتاب فی الحقیقت ایک بین الملّی المناک داستان ہے۔ قانون دان طبقہ اور فطرت انسانی سے دلچسپی لینے والے حضرات کو چاہئے۔ کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

میں نے ہیوگو کے اس شاہکار کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت میرے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اولاً ہیوگو کا تنسیخ سزائے موت کا نظریہ۔ ثانیاً وطنی ادبیات کی خدمت۔ ممکن ہے۔ کہ میں اپنے موخر الذکر مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں بہرحال میں نے سعی ضرور کی ہے۔

سعادت حسن منٹو

دیباچہ از وکٹر ہیوگو

دیباچہ از مصنّف

جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ تو اس کے سرورق پر مصنف کے نام کی جگہ ذیل کی چند سطور درج تھیں:

اس کتاب کی تکمیل دو اسباب کی مرہونِ منت ہو سکتی ہے۔ اولاً کسی تباہ شدہ انسان کے احساسات، مشاہدات اور مدرکات بوسیدہ کاغذات کی صورت میں دستیاب ہوئے ہوں جنہیں لفظاً لفظاً نقل کر دیا ہو۔ ثانیاً کسی حساس مفکر، شاعر یا فلسفی کے خیالات کا مجموعہ جن کے عمیق سمندر میں وہ برسوں غوطہ زن رہا۔ اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک اس کے افکار نے کتابی صورت اختیار نہ کر لی۔ ان دو اسباب میں کسی ایک کے ذہنی رشتہ کی استواری کا انحصار ناظرین پر ہے۔

کتاب کی پہلی اشاعت میں مصنف نے جو کہ فکر کو آزادانہ بہنے سے عمداً باز رکھا

وہ تفہیم نظریہ کا منتظر تھا۔ ایسا ہی ہُوا مصنف اب تنسیخ سزائے موت کے سیاسی او معاشری اسباب ادبی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ وہ اس امر کا اعلان کرتا ہے۔ کہ سرگزشت اسیر سے اُسکا مقصد سزائے موت کی تنسیخ ہے۔ اس کے پیش نظر کسی خاص مجرم کا تحفظ نہیں۔ وہ تمام مجرموں کی طرف سے وکالت کرتا ہے۔ خواہ وہ عہد حاضرہ کے ہوں۔ یا زمانۂ مستقبل کے مصنف انسانی حقوق کو سب سے بڑی عدالت یعنی سوسائٹی میں پیش کرتا ہے۔ فتوے سزائے موت کے المناک تاثرات عدالت کی فصاحت میں گم ہو جاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا سوال "یہ ایک واضح اور عیاں مسئلہ ہے۔ مجلس وکلا نے اس کی ہیئت کو تبدیل کر رکھا ہے۔ اس مسئلہ کو اس کے حقیقی قیام گاہ پر روز روشن میں دیکھنا چاہیئے۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ عدالت کی جگہ تختۂ دار پر لگانا چاہیئے۔ اور اس امر پر غور کرتے: ت جج کی نسبت قاتل کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔

انہیں تاثرات کی تخلیق و تولید کے لئے اس نے یہ کتاب لکھی۔ اگر ان تاثرات سے متاثر ہو کر سوسائٹی مصنف کے نظریہ کو شرف قبولیت بخشے۔ تو اس سے زیادہ کامیابی کا اور کیا سہرا ہو سکتا ہے۔

اس خیال کے پیش نظر کہ اس کی وکالت اس کے نظریہ کی طرح زمان و مکان امصار و افراد کی تخصیص سے آزاد ہو مصنف نے "سرگذشت اسیر" میں کسی خاص فرد۔ خاص مقام۔ خاص مجرم۔ خاص عدالت اور خاص جلاد کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جانفشانی کے ساتھ اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔ کہ ہر ایک حساس قلب اس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

وہ نہایت خوش ہو گا۔ اگر منصف نرم دل ہو کر مجرم کے احساسات قلب سے آشنا ہو جائیں۔

تین سال گزرے جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس وقت لوگوں

میں اس تصنیف کے متعلق بحث کا بازار گرم تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا۔ کہ یہ کسی امریکی کی تصنیف ہے۔ بعض اسے برطانی کتاب سمجھ بیٹھے تھے۔ بعض کے نزدیک یہ کسی چینی مفکر کی رہین منت تھی۔ کس قدر ظلم ہے۔ کہ انسان اپنے پانچیں باغ کی ندی کا سرچشمہ دریائے نیل کو قرار دے۔ یہ کتاب نہ امریکی ہے۔ نہ برطانی اور نہ چینی۔ مصنف نے سرگزشت اسیر کا تخیل ایسے مقام سے لیا جسے آپ بارہا دیکھ چکے ہیں۔ جہاں پر آپ کے دماغ میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے میری مراد "پیلس دی گریو" کا چوک ہے۔ جہاں تم پھانسی کا چبوترہ تعمیر کرتے ہو۔

اسی مقام پر مصنف کے ذہن میں سزائے موت کے ہولناک نتائج نے جگہ پکڑی۔ جب وہ اپنے مکان پر بیٹھا تماشائیوں کو مقتل کی طرف اندھا دھند بھاگتے دیکھتا۔ تب اس کا خیال مقتول کی طرف ہوتا۔ وہ اس کی مشکلات کا خاکہ کھینچتا۔ وہ خود کو مقتول تصور کرتا۔ تاکہ اس پر تدریجی مصائب واضح ہو جائیں۔ یہ المناک منظر صبح سے لیکر چار بجے شام تک جاری رہتا۔ جب پھانسی کا گھنٹہ بج چکتا۔ تب اس کے ذہن کو تھوڑا سا سکون حاصل ہوتا۔ اور وہ اپنے کام میں از سرنو مشغول ہوتا۔ "ال بیک" کے واقعہ قتل کے بعد اس نے یہ تصنیف شروع کی۔ اس تصنیف کی ابتداء کے بعد وہ سمجھتا۔ کہ مقتل میں اس کا کوئی حصہ نہیں بلکہ وہ اس کے خلاف صدا اٹھا رہا ہے۔ یہ محسوس کر کے اسے ایک گونہ تسلی ہوتی۔

اس کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہیں کہ سزائے موت کا وجود دنیا سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ اور اس کی خواہش ہے۔ کہ اقوام عالم کے روشن دماغ اور معلم اس کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ اس شجر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ جسے انقلاب بھی تباہ نہیں کر سکتا۔ مصنف بھی تختۂ دار کو سطح زمین کے ساتھ ہموار کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا

ہے ۔ اس تختۂ دار کو جو ہیمیت کی گذشتہ صدیوں سے نصب ہے ۔ اور جسے آج سے ستر سال پیشتر "نکریا" نے تباہ کرنے کی کوشش کی ۔ ہم نے ابھی عرض کیا ۔ کہ صرف تختۂ دار ہی ایک ایسی ہولناک چیز ہے ۔ جسے انقلاب بھی فنا نہیں کر سکا ۔ اگرچہ کلید انقلاب قفل زلسیت کو وا کرتی ہے ۔ اور وہ اپنے ساتھ قحط، زلزلے اور بجلیاں لاتا ہے تاہم سب کی تخریب میں تعمیر کا راز مضمر ہوتا ہے ۔ لیکن انقلاب بھی "سزائے موت" کو موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکا ۔

ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں ۔ کہ صرف جولائی کا انقلاب ہی ایسا انقلاب تھا ۔ جس نے موت کی سزا کو یک قلم موقوف کر دیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ یہ موجودہ دور اصطلاحی تحریک کا نتیجہ تھا ۔ جس نے لوئی پانز دہم، رسکو اور ردلس پیری کے خونین قوانین کا خاتمہ کر دیا ۔ ۱۸۳۰ء کے انقلاب نے ۱۷۸۹ء کی خون آشام تلوار کو نیام میں کر دیا ۔

اگست ۱۸۳۰ء میں ہم متوقع تھے ۔ کہ من جملہ دیگر عیوب کے سزائے موت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا ۔ کیونکہ اسوقت شرافت اور تہذیب کی لہر عام لوگوں میں دوڑ رہی تھی ۔ لیکن چند ہفتوں بعد ہمیں ناکام ہونا پڑا ۔ حقیقی آزادی کی طرح سزائے موت کی تنسیخ بھی ناممکنات میں سے تھی ۔

اکتوبر ۱۸۳۰ء میں جب فرانسیسیوں نے اپنے بطل عظیم نپولین کی لاش کو سرزمین فرانس میں دفن کیا ۔ سزائے موت کا مسئلہ چیمبر میں پیش ہوا ۔ دو دن تک اس مسئلہ کے متعلق گرما گرم بحث جاری رہی فریقین نے فصاحت کے دریا بہا دیئے ۔ اس بحث کا موضوع کیا تھا ؟ تنسیخ سزائے موت ! انکار یا اقرار ! واقعہ یہ ہے :۔

چار افراد نے . . . . سیاسیات کے اعلیٰ مدارج اور . . . . .
اس نکتہ تک پہنچنے کی کوشش کی جسے سیکنی جرم اور "بیجا ولی" ہم قرار دیتا ہے ۔

خیر اجرم ہو یا ہم قانون موت کی سزا دیتا ہے۔ اب چار دل بدبخت قیدی تھے۔ قانونی مجرم جن کی حفاظت پر تین سو سپاہی متعین تھے۔ اب کیا ہونے والا تھا؟ انہیں زندان کی گاڑی میں مقتل کی طرف ہجوم سے پرے نکالے جانا مشکل تھا۔ ان چار افرادِ کے نام کے اظہار کی ضرورت نہیں ——— چار افراد ہمارے زمانے کے ہیں۔ سزائے موت کی تنسیخ کے مسئلہ پر غور کرنے کیلئے چیمبر کا اجلاس منعقد ہوا۔

دیکھئے حضرات! کل تک یہی لوگ تنسیخ سزائے موت کو محض ایک خیالی شئے تصور کرتے تھے۔ اس سے قبل بارہا ان کی توجہ دار و رسن کی طرف مبذول کرائی گئی۔ یہ امر کتنا تعجب انگیز ہے۔ کہ آناً فاناً ان کے دماغوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا۔

یقیناً ان کے پاس مشتعل ہونے کیلئے کافی ذرائع تھے۔ وہ سزائے موت کے خاتمہ کیلئے بحث نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اپنے ذاتی مفاد کیلئے بہت کچھ کر رہے تھے۔ اس طرح خود غرضی اور جاہ طلبی سے انہوں نے مجلسی زندگی کو مسموم کر رکھا تھا۔

ہمارے لئے اس امر کا اعلان ضروری ہے۔ کہ ہمارا تعلق ان افراد سے نہ تھا۔ جو ان چار وزراء کی موت کے خواہاں تھے جب وہ زندان میں اسیر کئے گئے۔ اس وقت دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے قلب میں بھی ان کے لئے ہمدردی کے جذبات موجزن تھے۔ ہماری انتہائی خواہش تھی۔ کہ انہیں موت کے گھاٹ نہ اتارا جائے۔ بلکہ ان کی زندگیوں کو محفوظ رکھنے کیلئے خود کو تکالیف میں ڈالنے کیلئے تیار تھے۔

اگر تختہ دار پیرس میں نصب کیا جاتا۔ تو اس کے خلاف اسی قدر پر زور مظاہرہ ہوتا۔ کہ اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہوتا۔ ان مظاہرے کرنے والوں میں ہم پیش پیش ہوتے۔

میں اس امر کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کہ سیاسی اختلافات کی بناء پر سزائے موت عوام کو بہت زیادہ مشتعل کرتی ہے۔ اس کے نتائج تباہی، بربادی اور خون آشامی

کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ ہم سیاسی اور نفسیاتی بنا پر ان لوگوں کی جماعت میں داخل تھے جو ان وزراء کی جان بخشی کے خواہاں تھے

نمائندہ انقلاب ہمیں اتنا لیس مرے سے خبردار ہو جسے تم تن سے جدا کر رہے ہو۔ یہ فعل ہی لوگوں کو مشتعل کرنے کیلئے بہت کافی ہوتا ہے۔

ہماری خواہش تھی۔ کہ مجلس میں ان کے متعلق غور و فکر ہونے کے بعد سزائے موت کا فتویٰ کو منسوخ کر دیا جاتا۔

کیا انہوں نے کبھی جرائم کے اسباب پر غور کیا ہے؟ ان کی نگاہیں۔ ان کے اسباب وعلل سے بالکل ناآشنا ہیں۔ آہ! غربا بھوک سے تنگ آ کر چوری کرتے ہیں۔ اور چوری ہی تمام نتائج کو پیدا کرتی ہے۔ غریب اور لاوارث بچے جن کی پرورش سے انسانیت غافل ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں جیلوں کو آباد کرتے ہیں۔ ۱۸ سال میں نہ عبور دریائے شور کی سزا پاتے ہیں۔ اور ۴۰ سال کی عمر میں وہ تختۂ دار پر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔

آہ! برگشتہ بخت جنہیں تم بیدار بخت بنا سکتے ہو۔ ان کا کوئی پرساں حال نہیں۔ سزائے موت کی تنسیخ سے تم نوع انسان کو ممنون احسان بنا سکتے ہو تمہیں ایسا ضرور کرنا چاہیئے۔ خواہ تم ذاتی طور پر اس میں دلچسپی نہیں لیتے تمہارا یہ فعل سیاسی مراعات سے ارفع واعلیٰ ہو گا تم عوام کی مجلسی اور معاشری زندگی کو بہتر بنا سکتے ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ قوانین ساز تہذیب و تمدن کو کیا سمجھتے ہیں؟ ہمارا تنزل اور انحطاط قابل رحم ہے۔ عدل و انصاف نے دجل و فریب کا جامہ پہن رکھا ہے۔ قانون ایک مضحکہ خیز امر ہو چکا ہے۔

جس شخص کو تم موت کی سزا دیتے ہو۔ اس کے متعلق علی الصبح بازاروں اور کوچوں میں اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کے سوانح حیات جرم، سزا اور اس کی تکالیف کا اخبار میں توسیع اشاعت کی غرض سے ذکر کیا جاتا ہے۔ کیسی خوفناک تجارت ہے وہ سکہ جو اُ

کے ہاتھ تک پہنچتا ہے۔ خون آلود ہوتا ہے۔ . . . .

سزائے موت کے لرزہ براندام نتائج

سزائے موت!!!

آہ! کسقدر المناک!

سزائے موت کے جواز میں آپ کے پاس جس قدر بھی دلائل و براہین ہیں۔ ان سے ہمیں آگاہ کریں۔

میں نہایت متانت سے دریافت کرتا ہوں۔ کہ اس کا جواب دیا جائے۔ میرا روئے سخن مقننین کی طرف ہے مجھے دماغی عیاشیوں سے کوئی سروکار نہیں۔

بعض افراد سزائے موت کو دیگر مسائل کیطرح خلاف قیاس اور بعید العقل تصور کرتے ہیں۔ اور بعض سزائے موت کی تنسیخ پر صرف اس لئے زور دیتے ہیں۔ کہ انہیں اس سے نفرت ہے بعض اصحاب کے نزدیک یہ صرف ادبی مسئلہ ہے۔ میں ایسے لوگوں سے مخاطب نہیں ہوں معتزلین اور منطقیون اور فقہا کی عنان توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہوں۔ ان لوگوں کی توجہ جن کے نزدیک سزائے موت جائز ہے۔

انہیں اپنے دلائل پیش کرنے چاہئیں۔

قانون دان اصحاب کا ایک طبقہ سزائے موت کو جائز قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتا ہے :-

اولاً مجلسی دائرے سے ایسے متنفس کا وجود قابل اخراج ہے۔ جس نے مجلسی زندگی میں تلخی پیدا کی۔ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو سوسائٹی کو اس سے مزید نقصان کا احتمال ہے مگر یہی ہے۔ تو میرے خیال میں حبسِ دوام کافی ہے۔ سزائے موت کے کیا معنی! تم کہتے ہو کہ قیدی جیل سے فرار ہو جائیگا۔ اس کی خوب نگہداشت کرو آہنی سلاخیں تنہائی کو تنگ بنانے کیلئے کافی ہیں۔ اور جب کہ محافظ جیل کا وجود کافی ہے۔ تو جلاد کی

کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ جواب دیتے ہیں۔ "سوسائٹی کو ضرور انتقام لینا چاہئے سوسائٹی ضرور سزا دے۔"

انتقام ایک انفرادی فعل ہے۔ سزا کا اختیار صرف خدا کو ہے۔ سوسائٹی کا راستہ انتقام اور سزا کے درمیان ہے۔ سزا اس دائرۂ اقتدار سے باہر ہے۔ انتقام سوسائٹی کے شایانِ شان نہیں۔ سوسائٹی کو انتقام کیلئے سزا نہیں دینی چاہئے بلکہ اسے مجرموں کی اصلاح کرنی چاہئیے۔

سب سے آخری دلیل "نظریہ عبرت" ہے۔

"ہمیں نظریہ عبرت کیلئے مثالیں قائم کرنی چاہئیں۔ وہ سزائیں جو مجرموں کو دی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کو خوفزدہ کرتی ہیں۔ جن کے آغوشِ اذہان میں جرائم پرورش پاتے ہیں۔"

خوب! سب سے اول ہم نظریۂ عبرت کے امکانات سے انکار کرتے ہیں۔ سر بازار سزائے موت سے بیان کردہ تاثرات نہیں ہوتے۔ بلکہ جمہور کے دماغوں پر ایسے ہولناک مناظر سے خطرناک اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے احساسات اور حسیات قلب مجروح ہوتے ہیں۔ ان کے اخلاق پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ ہمارے پاس متعدد مثالیں موجود ہیں۔ جن سے ہم اپنے آراء کی تائید و حمایت کر سکتے ہیں۔ فی الحال ہم صرف ایک پر اکتفا کریں گے۔

آج سے ٹھیک دس روز قبل جب لوئی کاس کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ تو ایک جمِ غفیر نے اس بے حس لاش کے گرد اگرد مجنونانہ رقص سے اظہار انبساط کیا....

نظریہ عبرت!

اگر ان مثالوں کی موجودگی میں بھی تم "نظریہ عبرت" کے قائل ہو۔ تو گردش ایام کا رُخ ماضی کی طرف پھیر کر پندرھویں سولھویں صدی عیسوی میں لے چلو حقیقت میں خوفناک بن جاؤ گے۔ ہمارے لئے تکالیف و مصائب کے دروازے کھول دو ہر رہگذر پر تختۂ دار نصب کر دو بدنی سزا کو عام کر دو۔ پیرس کے بازاروں میں اور دوکانداروں کی طرح ایک دوکان جلاد کی ہو جہاں انسانی گوشت پوست دیگر اجناس کی طرح فروخت ہو فنا کو بادۂ ہر جام کرنے اور سزائے موت کو اس طرح عام کرنے سے تم نظریہ عبرت کو زیادہ کامیاب بنا سکتے ہو۔

کیا تمہیں اس امر کا یقین ہے۔ کہ جب تم شہر سے بہت دور ایک غیر آباد حصہ میں ایک انسان کو موت کے گھاٹ اتارتے ہو اس وقت تمہارے پیش نظر بھی نظریہ عبرت ہوتا ہے؟

دن کے وقت ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن علی الصبح تمہیں کسے سبق دینا مقصود ہے کس کے لئے مثال قائم کی جاتی ہے۔ غالباً حجر و شجر کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مجرموں کو سزائے جرم تخلیہ میں دی جاتی ہے۔ کیا تم سزائے موت سے خائف ہو یا ہجوم کی ذہنیت سے ہراساں؟

میزان عقل میں بڑے سے بڑے مجرم کو تولو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ سوسائٹی کو اس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں جسکو وہ عطا نہیں کر سکتی۔

جس انسان کیلئے تم موت کی سزا تجویز کرتے ہو۔ اس کی معاشری زندگی کی ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

اولاً وہ شخص افراد خاندان اور صحبت احباب سے محروم ہے اس صورت میں وہ صحیح تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکا جب اسکے دل و دماغ کی اصلاح کیلئے کوئی۔

سی نہیں کی گئی۔ تب تمہیں اس معاشری یتیم کے قتل کرنے کا کیا حق ہے وتم اسے اسلئے قتل کرتے ہو۔ کہ عہد طفولیت عدم نگہداشت کی نذر ہوا۔ تم اسے اپنے گناہ کی سزا دیتے ہو۔ تم اس بدبخت کو جرائم کا لباس پہناتے ہو۔

اس نے جہالت کی گود میں ——— پرورش پائی۔ یہ اس کی تقدیر کا قصور ہے۔ وہ بالکل بے گناہ ہے ——— تم ایسے انسان کا خاتمہ کرتے ہو جو بالکل معصوم تھا۔ تم معصومیت کو تختہ دار پر لٹکاتے ہو۔

ثانیاً وہ انسان جب تم نے موت کی سزا دی۔ وہ اہل وعیال رکھتا ہے۔ ایک خاندان کا فرد ہے۔ کیا اس صورت میں تم صرف ایک انسان کو زندگی سے محروم کرتے ہو؟ نہیں! تم اسے موت کی سزا دیتے وقت اس کے افراد خاندان کے آسمان امید پر ادبار کے سیاہ بادل پیدا کرتے ہو۔ اس صورت میں تم معصوموں کو سزا دیتے ہو۔ معصومیت پھر تمہاری نوحہ خوانی کرتی ہے۔

سزائے موت کو تم خواہ کسی رنگ میں جامہ پہناؤ اس کا دار صرف معصومیت پر ہی ہوگا۔

ایسے مجرم کو حبس دوام کی سزا دو کیونکہ تنگ و تاریک کوٹھری میں بھی وہ اپنے لواحقین کیلئے سامان وزلیت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن وہ مرقد کی گہرائیوں سے ان کی معاونت کیسے کر سکتا ہے؟

کیا تم اس وقت خوفزدہ نہیں ہوتے جب تم اس کے لڑکے اور لڑکیوں کا خیال کرتے ہو۔ ——— ان بچوں کا خیال جن سے زندگی کا سہارا چھین لیا گیا ہے۔

کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ آئندہ پندرہ برس میں بیٹا زندان میں ہوگا۔ اور بیٹی تعیش پسند امراء کی نفسانی خواہش کے بہلانے کا ذریعہ ہوگی؟

کیا تم نے کبھی اس کی روح کے متعلق غور کیا؟

کیا تم اس کی زمانی اور مکانی کیفیت سے آگاہ ہو؟

بعض منطق پرست حضرات کے نزدیک یہ ایک جذباتی اور ہنگامی دلیل ہوگی کیونکہ وہ ذہنی براہین کے قائل ہوتے ہیں ۔ میں دماغ کی نسبت دل کا زیادہ قائل ہوں ۔ دلیل احساس اور تجربہ ہمارے حمایت پر ہیں ۔

جن ممالک میں سزائے موت منسوخ ہو چکی ہے ۔ وہاں وارداتِ قتل ہر سال کم ہوتی جاتی ہیں ۔ اس وزنی دلیل کی اہمیت کا اندازہ لگاؤ ۔

زمانہ خود بخود اس مسئلہ کو حل کر دیگا ۔ گذشتہ صدی سے سزاؤں میں نرمی کا دخل ہو چکا ہے خونی سزا قریباً منسوخ ہو چکی ہے ۔ اس خلاف عقل سزا سے فرانس کو عنقریب نجات حاصل ہوگی ۔

ازمنہ عتیق میں معاشری قصر تین ستونوں یعنی پروہت ، بادشاہ اور جلاد پر استوار تھا مدت ہوئی کہ ایوان انسانیت کے دریچوں سے یہ صدا آئی "پروہت رخصت ہو چکے ہیں" ازاں بعد ایک اور آواز آئی "بادشاہ رخصت ہو گئے" اب تیسری آواز بلند ہونیکا وقت ہے جو بانگ دہل اعلان کر دے "جلاد کو نکال دو"

وہ جنہیں پروہت کے رخصت ہونے کا غم ہے ۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے جو بادشاہ کے خاتمہ پر افسوس ظاہر کرتے ہیں ۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہمارا ملک موجود ہے نیز جنہیں جلاد کے رخصت ہونیکا رنج ہوگا ان کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ۔۔۔

تختہ دار کی قطع و برید سے ہمارے معاشری نظام میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑے گا ۔ معاشری نظام کا سنگ بنیاد تختہ دار نہیں ہو سکتا ۔ تمدن ایک تغیر پذیر سلسلہ ہے میں تمہاری معاونت چاہتا ہوں ۔ کس مسئلہ میں؟ تبدیلی قوانین میں مسیح کے اخلاقی قوانین انسانوں پر پھر حکمران ہوں گے وقت آنیوالا ہے جب ہم جرم کو مرض تصور کریں گے اور جیلوں کی جگہ ان امراض کے رفع کرنے کے ڈاکٹر ہوں گے زندانوں کی جگہ شفاخانے ہونگے افق پر اخوت و محبت کا آفتاب طلوع ہوگا ۔

۱۵ مارچ سنہ ۱۹۲۱ء

فرہنگ معلقہ المیہ

افراد

۱ مادام وی بلنول

۲ عسکری

۳ ارگاسطے

۴ مرثیہ گو

۵ فلسفی

۶ مرد فربہ

۷ مرد لاغر

۸ خاتون

۹ خادم

ایک کمرہ!

مرثیہ گو شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے۔

....

....

....

دوسرے دن میدان میں نعش بلائے یار نظر آیا

باوفا کتا دریا کے کنارے سراپا انتظار تھا

واپسی پر حسینہ کی آنکھیں نم آلود تھیں

از منۂ قدیم کی یادگار — قلعہ سے وہ کسی کو

نمناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی "

لیکن خوش الحان مطرب کی صدا

ہاں اسی آتش نفس مغنی کی صدا

صحرائی فضاؤں میں گم تھی

جملہ حاضرین :۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیسے بلند شعر ہیں

مادام دی بلبول بہ مقطع کے شعر میں ناقابلِ بیان اسرار ہے جو آنکھوں میں بے

آنسو بہ آتا ہے۔

مرثیہ گو :- اصل واقعہ انجانا پنہاں ہے۔

عسکری :- وجدانی حالت میں (مطرب ——— اور معما کیسے رومان انگیز ہیں۔

مرثیہ گو ——— لیکن رومان کی حد سے تجاوز نہیں۔

عسکری :- میں ان رومان آفرین اشعار کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا میں ان اشعار کی خاطر دنیا بھر کے رومان آفرین اشعار قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عسکری :- لیکن جنٹل فرانسیسی لفظ نہیں۔ ہم کیسٹل لکھتے ہیں۔

یکے از حاضرین :- دیکھئے جناب ہم فرانسیسی میں جنٹل نہیں لکھتے بلکہ گاتھک۔

مرثیہ گو :- گاتھک شعر میں مستعمل نہیں۔

یکے از حاضرین :- آہ! معانی میں اختلاف ہے۔۔

مرثیہ گو :- جناب میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ جو فرانسیسی زبان کو اشعار میں لا کر اس کی اصلی صورت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اٹلہ ہمیں رونڈ رڈ اور پڑی بیوف کے زمانے میں لے جاتے ہیں، میں رومان پسند ہوں۔ لیکن درجۂ اعتدال تک اسی طرح جذباتی شاعری میں بھی۔

میں لطیف اور اندوہ آگین اشعار پسند کرتا ہوں۔ لیکن خوفی اور بھیانک اشعار سے مجھے نفرت ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ دنیا میں ایسے احمق ہیں۔ جو انہیں خیالات کی اشاعت سے ——— ٹھہریئے! کیا آپ نے وہ نیا ناول دیکھا ہے؟

خواتین :- کونسا ناول؟

مرثیہ گو :- سرگزشت اسیر یا پھانسی!!

مرد فربہ :- بس بس مجھے معلوم ہے۔ کہ آپ کیا کہنے والے ہیں۔ اس کتاب کا سرورق ہی لرزہ بر اندام کر دیتا ہے۔

مادام ڈی بلبنول ہ۔ بعینہ یہی حال میرا ہے۔ بہت خطرناک کتاب ہے۔ وہ میرے پاس اتفاقاً موجود ہے۔

خواتین ہ۔ دکھلیئے تو! دکھلیئے تو!

(کتاب دست بدست ہر ایک کے پاس پہنچتی ہے)

ایک خاتون (کتاب کا نام پڑھتی ہے) سرگذشت اسیر یا پھانسی!!!

مرد فربہ ہ۔ مادام خدا کے لیے!!

مادام ڈی بلبنول ہ۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ یہ کتاب بہت خوفناک ہے۔ یہ پڑھنے والوں کو بیمار کر دیتی ہے۔ اور ان کی خوابوں میں ڈراؤنی صورت میں نمودار ہو کر ان پر نیند حرام کر دیتی ہے۔

ایک خاتون ہ۔ میں اسے ضرور پڑھوں گی۔

مرد فربہ ہ۔ ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ تمدن دن بدن روبہ تنزل ہے۔ میرے خدا! ایک مجرم جسے موت کی سزا مل چکی ہو۔ اسکی آخری لمحات کی کیفیت۔ اور اس کی جسمانی تکالیف کا بیان کس قدر مہمل خیال ہے۔ کیا یہ خیال قابل نفرت نہیں؟ معزز خواتین! کیا آپ کو یقین ہے۔ کہ مصنف نے مرنے موت پر بحیثیت ایک مصلح کے بحث کی ہے۔

عسکری ہ۔ یہ فی الحقیقت بیہودگی کی بہترین مثال ہے؟

مادام ہ۔ اس کا مصنف کون ہے؟

مرد فربہ ہ۔ کتاب کی پہلی اشاعت میں سرورق پر مصنف کا نام موجود نہ تھا۔

مرتبہ گو ہ۔ یہ وہی مصنف ہے جو اس سے قبل دو ناول اور بھی لکھ چکا ہے میرے ذہن سے ان کے نام محو ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ٹھیک کتاب کا آغاز مارگن سے ہوا۔ اور انجام تختہ دار پر۔

کتاب کے ہر باب سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک بچے کو نگلنے جا رہا ہے۔

مرد فربہ:۔ کیا وہ کتاب آپ کی نظروں سے گذری ہے؟

مرثیہ گو:۔ ہاں جناب! واقعہ کا محل وقوع برفستان تھا:

مرد فربہ:۔ —— برفستان —— کس قدر خوفناک ہے!

مرثیہ گو:۔ دوسری کتاب میں قصائد اور رزمیہ اشعار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ کتاب میں ان دیوؤں کا ذکر ہے جو انسانی گوشت پر زندہ رہتے ہیں

عسکری (مسکراتے ہوئے) اس کے اشعار حیرت آفریں ہوں گے۔

مرثیہ گو:۔ اس نے ایک تمثیل بھی لکھی ہے۔ وہ اسے تمثیل کہتا ہے۔ جس میں یہ خوبصورت جملہ مندرج ہے:۔

کل پچیس جون ایک ہزار چھ سو ستاون عیسوی ——————

یکے از حاضرین:۔ واہ! واہ کیا خوبصورت شعر ہے!

مرثیہ گو:۔ معزز خواتین! یہ شعر ہندسوں میں لکھا جا سکتا تھا۔

کل ۲۵ جون سنہ ۱۶۵۷ء ——————

وہ مسکراتا ہے —————— سب ہنستے ہیں۔

عسکری:۔ یہ موجودہ زمانے کی عجیب وغریب شاعری کا نمونہ ہے۔

مرد فربہ:۔ شعر وشاعری سے اسے کیا نسبت —— کیا نام ہے اس کا؟

مادام:۔ ایک ناپاک انسان

مرد فربہ:۔ قابل نفرت ہستی۔

ایک جوان خاتون:۔ —— ایک صاحب جو اسے جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ——————

مرد فربہ:۔ تم انہیں جانتی ہو جو اسے جانتا ہے؟

جوان خاتون :- جی ہاں! انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ایک سادہ مزاج اور تنہائی پسند جو اپنا بیشتر وقت اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بسر کرتا ہے۔

مرثیہ گو :- اور بحوش شب میں سیاہ ترین خیالات کی پرورش کرتا ہے۔ مجھے اتفاقیہ ایک شعر کے مطالعہ کا موقع ملا جس میں اس نے انہیں تنگ و تار خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مرد فربہ :- تم کہتی ہو۔ کہ اس کے بچے ہیں۔ ناممکن! خاتون جب اس نے ایسی خوفناک کتاب لکھی ہو۔

یکے از حاضرین :- آخر اس کتاب کا مقصد۔

مرثیہ گو :- میں کیونکر جانوں۔

فلسفی :- کتاب کا مقصد تنسیخ سزائے موت ہے

مرد فربہ :- میرے نزدیک اس کا مقصد دہشت آفرینی ہے۔

عسکری :- خوب! گویا جلاد سے مہارت ہے۔

مرثیہ گو :- اس کے نزدیک تختۂ دار ہی تمام مصائب کا سرچشمہ ہے۔

مرد فربہ :- ہرگز نہیں! تنسیخ سزائے موت کے مسئلہ پر صرف چند سطور میں بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا باقی حصہ جذباتی ہے۔

فلسفی :- اس موضوع پر کتاب لکھتے وقت دلائل اور براہین پیش نظر ہونے چاہئیں منطق کے دامن کو ہاتھ سے کبھی نہ کھونا چاہیئے۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا۔ فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے کتاب مہمل اور ناقص ہے۔ تمثیل یا ناول کے دائرہ سے سزائے موت کی بحث خارج ہے۔

مرثیہ گو :- بلند! خرافات کا! کیا یہ فن کاری ہے؟ میں نہیں جانتا۔ کہ مجرم کون ہے اس نے کیا کیا۔ میری طرح اور بھی تو کوئی نہیں جانتا۔ شاید وہ بدمعاش ہو۔

کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں۔ کہ وہ میرے لئے اس چیز میں مذاق پیدا کرے جسکا مجھے علم ہی نہیں۔

مرد فربہ:۔ مصنف کو یہ بھی اختیار نہیں۔ کہ وہ ایک مجرم کی جسمانی تکالیف سے ہمیں خوفزدہ کرے۔ ہیں کسی المناک حادثہ یا کسی شخص کو اپنے ہاتھوں سے اپنی جان تلف کرتے ہوئے دیکھ کر اتنا متاثر نہیں ہوتا۔ جتنا ایک کتاب پڑھنے سے ——— ایک ناول کا مطالعہ تمہیں لرزہ براندام کرسکتا ہے۔ رات کی نیند تم پر حرام کرسکتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد میں دو روز تک صاحب فراموش رہا۔

فلسفی:۔ فی الحقیقت یہ ایک لغو اور بیہودہ کتاب ہے۔

مرثیہ گو:۔ (طنزاً) کتاب! کتاب!

فلسفی:۔ جیسا کہ آپ نے پہلے ارشاد فرمایا۔ یہ کتاب کسی اصلیت پر مبنی نہیں۔ میں خشک مضامین کا دلدادہ ہوں۔ لیکن اس کتاب کا کوئی کردار بھی میری طبع کے موافق نہیں طرز تحریر بھی ناقص ہے۔

کیا آپ میرے ساتھ متفق ہیں۔

مرثیہ گو:۔ بے شک! بے شک!

فلسفی:۔ مجرم کا کردار دلچسپی سے خالی ہے۔

مرثیہ گو:۔ وہ دلچسپ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اس کا دامن گوناگوں جرائم سے رنگین ہے۔ میں اسے مختلف صورت میں پیش کرتا ہیں اپنے مجرم کی سرگذشت کو یوں بیان کرتا ہے۔ اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ——— اعلیٰ تعلیم ——— محبت ——— رقابت ——— ناکردہ گناہ ——— تاسف

چونکہ انسانی قوانین پیچیدہ ہیں۔ اسلئے اسے موت کی سزا دی جاتی ہے تب اور تب میں سزائے موت کے مسئلہ پر بحث کرتا۔

مادام :- واہ! واہ!

فلسفی :- معاف کیجئے۔ آپ کے خیال کے مطابق بھی کتاب بے معنی ہے۔ ایک خاص حلوشہ سب کو یکساں متاثر نہیں کر سکتا۔

مرثیہ گو :- بہت خوب! بہتر تھا کہ کتاب میں کسی ہیرو کا تذکرہ ہوتا۔ مثلاً مالش اربی۔

متقی :- مالش اربی کے آخری لمحات۔ تب مصنف ہمارے سامنے ایک اچھا واقعہ پیش کرنے میں کامیاب ہو سکتا۔

میں شور مچاتا چیخ و پکار کرتا۔ مالش اربی کے ساتھ خود بھی تختۂ دار پر لٹکنے کیلئے تیار ہو جاتا۔

فلسفی :- میں ہرگز تیار نہ تھا۔

عسکری :- میں بھی ہرگز نہ ہوتا۔ آپ کا مالش اربی ایک انقلابی تھا۔

فلسفی :- مالش اربی کی موت سزائے موت کے خلاف کوئی دلیل بہم پہنچاتی ہے۔

مرد فربہ :- سزائے موت! ہم اس خلجان میں کیوں مبتلا ہیں۔ آپ کا اس نے کیا بگاڑا ہے۔ اس کتاب کا مصنف غیر تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔

مادام :- یقیناً وہ سنگ دل ہوگا۔

مرد فربہ :- وہ ہمیں مجبور کرتا ہے۔ کہ ہمیں زندان اور تختۂ دار کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ ہماری طبیعتوں کے ناموافق ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ یہ مقام نہایت غلیظ ہیں۔ لیکن سوسائٹی کو ان سے کیا تعلق؟۔

مادام :- مقننین طفلانِ مکتب نہیں۔

فلسفی :- واقعات کو صحیح رنگ میں پیش کرتے ہوئے ————

مرد لاغر :- جہاں تک صداقت کا تعلق ہے۔ اس میں ذرہ بھر نہیں۔ ایک شاعر کو حقیقی واقعات سے کیا تعلق۔ کتاب کا مصنف یقیناً سرکاری وکیل ہوگا۔ میں۔

لے ایک اخبار میں وہ تبصرہ دیکھا جو اس کتاب پر لکھا گیا۔ مبصر رقمطراز ہے۔ کہ مجرم
سر کٹاتے وقت ایک لفظ بھی زبان پر نہ لایا۔ بہت خوب! لیکن میں نے ایک
مجرم دیکھا جو قتل گاہ میں شور مچا رہا تھا۔
فلسفی :۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں بھی کچھ کہوں۔
مرد لاغر :۔ ٹھہریئے! حضرات!! تختۂ دار اور زندان دونوں کو بدذوقی اور بدمذاقی
کی دلیل ہیں۔ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصنف ہمارے مذاق کو
خراب اور ہمارے قلب کو صحیح احساسات سے عاری کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ
لوگ ہیں جو اپنے تئیں ادیب سمجھتے ہیں۔
میں فرانس کے ادارۂ علمیہ کا رکن بننے کیلئے تیار ہوں۔ میرے ساتھ ارگاسلے
بھی تیار ہے۔ کیوں ارگاسلے! پھانسی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟
ارگاسلے :۔ مجھے اپنی عزت کی قسم! میں اسے ہرگز پڑھنے کیلئے تیار نہیں۔ لوگوں کا
خیال ہے۔ کہ اس کتاب کے بعض ابواب کلیسا اور ریاست کے خلاف ہیں۔ اگر
میں شاہی وکیل ہوتا تو ....
عسکری :۔ خوب! شاہی وکیل! کیوں جناب پروانۂ آزادی کے متعلق کیا فرماتے ہیں
آپ :۔ اور کیا خیال ہے آپ کا آزادیٔ مطبع کے بارے میں۔
اس زمانہ میں ایک شاعر تنسیخ موت پر ایک کتاب لکھتا ہے جس کی ہم سب
مخالفت کرتے ہیں آہ! قدیم شخصی حکومت میں ایسی کتاب کیوں کر شائع
ہو سکتی۔
تسخیر بیسٹائیل کے بعد ہم اس قسم کی کتب لکھ سکتے ہیں۔ کتابیں بہت خوفناک
نقصان پہنچاتی ہیں۔
مرد فربہ :۔ خوفناک! ہم خاموش تھے۔ کسی سطر پر غور نہیں کر رہے تھے۔ یہ سچ ہے۔

کہ ہم فرانس میں لگا ہے بگلہ ہے، ایک آدھ سر تن سے جدا کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ بغیر کسی شور و غوغا کے ہوتا ہے کوئی شخص بھی اس مسئلہ پر غور نہیں کرتا۔ اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہم نے ان معاملات پر کبھی غور و فکر نہیں کی۔ لیکن اس کتاب نے ہمارے لئے درد سر پیدا کر دیا ہے۔

مرد لاغر:۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد جیوری کے اراکین کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔

ارگاسطے:۔ یہ ان کے ضمیر کو تکلیف دیگی۔

مادام: آہ! کتابیں! کتابیں!! ناول کا کس نے ذکر کیا تھا۔

مرثیہ گو:۔ بعض کتابیں ہمارے معاشری نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔

مرد لاغر:۔ جس کو پڑھ کر رومان پسند بغیر سوچے سمجھے انقلاب کرنا چاہتے ہیں۔

مرثیہ گو:۔ ان رومان پسندوں پر غور کیجئے۔

مرد لاغر:۔ کور ذوقی! کور ذوقی!!

ارگاسطے:۔ بالکل صحیح!

فلسفی:۔ اس کتاب میں غیر ممکن الامر واقعات کا تذکرہ ہے۔

ارگاسطے:۔ قابل نفرت ——— قابل حقارت کتاب۔

مادام:۔ اسے نظر آتش مت کیجئے۔ یہ مستعار لی گئی ہے۔

عسکری:۔ ان قصوں کو چھوڑیئے۔ عادات و رسوم سب خراب ہو چکے ہیں۔

مادام:۔ آپ کو ہمارے وقتوں کی یاد باقی ہے کیا؟

عاشق مزاج! ہم عیش پرست تھے۔ ہمارا کام شعر و شراب سے تھا۔ ایم دی لکلا سے بہترین ترانہ کس کا ہو سکتا ہے۔ جو اس نے ایک ناچ سے متاثر ہو کر لکھا۔

مرد فربہ:۔ آہ! مسرت بخش ایام!! اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ کتابیں لکھی ہیں تو اس قسم کی۔ بولیتو کیا خوب لکھتا ہے۔

آرٹ کے انحطاط کے ساتھ تہذیب و تمدن کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے "۔

فلسفی :۔ کیا یہاں جامِ صحت پیا جا سکتا ہے۔

شاعر :۔ ہاں! آہستہ آہستہ۔

{ ہم پس ہیں "

مرد لاغر :۔ وہ سزائے موت کی تنسیخ کے خواہاں ہیں۔ اور اسی امر کیلئے " پھانسی ایسی خوفناک کتابیں لکھ کر اپنی کور ذوقی کی مثال پیش کرتے ہیں۔

مرد فربہ :۔ میرے اچھے دوست! ہم اس خوفناک کتاب کے متعلق مزید گفتگو کرنے کیلئے تیار نہیں —— خیر! یہ تو بتلائیے کہ اس آدمی کا کیا حشر ہوا جس کی درخواست ہم نے تین ہفتے پیشتر روکی تھی۔

مرد لاغر :۔ صبر کیجئے! میں ابھی جاتا ہوں۔ اور واپسی پر اپنے افسر کو لکھونگا۔

" خادم داخل ہوتا ہے "

کھانا حاضر ہے

زنداں

سزائے موت

زنداں کی چار دیواری میں متواتر پانچ ہفتوں سے یہی ہولناک حقیقت میرے لئے سوہانِ روح رہی ہے۔ اسی دہشت ناک خبر نے مجھ تنہا بے یار و مددگار کو دبا رکھا ہے۔

کبھی وہ بھی دن تھا جب کہ میں بھی آپ ہی کی طرح تھا۔ میرا دل جس میں ہر طرح کے ولولے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ مناظر فطرت کا متلاشی تھا جب کہ ہر ساعت میرے لئے مژدہ لاتی۔ اور بھی بھی وہ شیرگان کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لیتی جبکہ میں اُن حسن کی دیویوں کے ساتھ چھٹکی ہوئی چاندنی میں شاہ بلوط کے گھنے درختوں کی اوٹ میں گلگشت کرتا —— جبکہ میں آزاد تھا۔

مگر اب قید و بند میں ہوں۔ آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا تنگ و تار کوٹھری میں بے بال و پر پرندہ کی طرح اسیر کیا گیا ہوں۔ یہ تو ہے جسمانی قید۔ مگر میرے خیالات بھی اسی طرح مقید ہیں۔ صرف .... اور صرف ایک خیال —— ہیبت ناک مہیب ہے۔ اور ناقابل برداشت خیال مجھ پر پوری طرح مسلط ہے۔ جس کی خوفناک یاد ایک گھڑی یا پل کیلئے بھی میرے دل سے محو نہیں ہوتی جس کی صحت کا مجھے کامل یقین ہے۔ یعنی سزائے موت .... آہ!

اس کا نام لیتے ہی میری رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ میں ہزار اپنا دل بہلاؤں اس کے بہلانے کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لوں مگر اس خیال —— اس حقیقت نفس الامری کے دو حرف لیے ہاتھ مجھے پھر اسی وحشتناک حالت میں صدمے میں بھیجے

پیچھے، کسی بدروح یا بھوت کی طرح پڑا ہوا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کسی دن آنکھ لگ جاتی ہے۔ تو یہ کمبخت ڈراؤنی اور خون سرد کر دینے والی خوابوں میں خنجر کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

میں ابھی ابھی ایک دہشت خیز خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہوں۔ میں نے اپنے دل کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ حوصلہ رکھو۔ یہ تو محض خواب تھا۔

لیکن میری خواب آلودہ آنکھوں کے سامنے خوفناک حقیقت میرا منہ چڑا رہی ہے مجھے اپنی قسمت کا فیصلہ آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا ہے۔ قیدخانے کی زرد اور مرطوب دیواریں۔ اندھی سی لالٹین کی مدھم شعاعیں ——— لوہے کے بھاری بھرکم دروازے جیل کے سنتری کی خوفناک صورت ——— میرے کپڑوں کی ہیئت کذائی کیا اس گھناؤنی حقیقت کی پرزور تائید نہیں کر رہی ہے۔؟

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جو مجھے سزائے موت ایسا لرزہ خیز پیغام دے رہی ہے۔

(۲)

اگست قریب الاختتام تھا۔ موسم سہانا اور خوشگوار

میرا مقدمہ تین یوم تک عدالت میں پیش ہوتا رہا۔ ہر روز کمرہ عدالت تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا جیسے کسی مرگ پر لوگ ماتم پرسی کرنے آئے ہوں ان تین ایام میں منصف، وکیل، گواہ اور افسر ہر روز میری مصیبت زدہ آنکھوں کے سامنے گذرے میری دھندلی اور نحیف آنکھیں اس نظارہ کی تاب نہ لا سکیں خوف و ہراس کے مارے میں نے وہ کٹھن راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ مگر آخر انسان تھا تین دن کی متواتر ذہنی کوفت اور ماندگی نے مجھے مردہ سا کر دیا تھا لہٰذا نیند نے اس نیند سے جو مجھے ہفتوں سے نصیب نہ ہوئی تھی سلا دیا۔

میں ابھی اس غفلت کی نیند سے بیدار نہ ہوا تھا۔ کہ سپرنٹنڈنٹ جس نے مجھے بلا بھیجا خفیف آمدٹ آج سے پہلے مجھے گہرے خیالات سے چونکا کر دیتی تھی۔ مگر آج محافظ کے لوہے کے بوٹ کی بھاری آواز — آہنی سنچوں کی لرزہ خیز جھنجناہٹ بھاری پھر کم دروازے کی خوفناک رگڑ مجھے اس بیہوشی سے خبردار نہ کر سکی اچانک میں نے اپنے کندھوں پر کوئی سخت سا ہاتھ محسوس کیا۔ اور کانوں میں کسی شخص کو درشت لہجہ میں پکارتے ہوئے سُنا ۔

"اٹھو! تمہیں بلایا ہے ۔ انہوں نے"

میں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور تنکوں کے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا جیل کے محافظ کی ڈراؤنی شکل میرے سامنے تھی۔

سامنے والی کھڑکی سے میں نے باہر دھندلی سی روشنی دیکھی۔ دن چڑھ گیا تھا۔ اور یہ روشنی سورج کی تھی۔ آہ! مجھے پھر ایک دفعہ دن کی روشنی دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔!!

"موسم خوب سہانا ہے" میں نے محافظ سے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ خاموش رہا۔ شائد اس لئے کہ وہ مجھ بدبخت کی خاطر اپنی زبان سے لفظ نکالنا اس کو بے فائدہ ضائع کرنا سمجھتا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ایسے کہ جیسے اس کی ضمیر نے ملامت کی ہو وہ بولا۔

"بہت خوشگوار ہے"

میں بے حس و حرکت سورج کی ان مدھم شعاعوں کی طرف حریفانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جو میرے قفس کی چھت پر آزادانہ کھیل رہی تھیں۔

"کیسا پیارا دن ہے" میں نے پھر محافظ سے کہا۔

"درست ہے"۔ مگر وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔

ان الفاظ نے مجھے میری اصلی حالت سے خبردار کر کے خوف و ہراس کے اسی تنگ و تاریک اور عمیق گڑھے میں پھینک دیا۔ تب میں نے اپنے دماغ میں عدالت کی کرسیوں پر ججوں کو شاہانہ لباس پہنے ہوئے دیکھا۔ وہ میری طرف گھور رہے تھے۔ یہ جیوری کے ارکان تھے جن کے ہاتھوں میں میری قسمت کا فیصلہ تھا۔ جب میں سو رہا تھا۔ وہ میری قسمت کا فیصلہ مرتب کرنے میں مصروف تھے

میں اٹھا۔ مگر میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ جسم کا ہر عضو ارتعاش پذیر تھا۔ گرتے گرتے بچا۔ مگر قہر درویش بر جان درویش۔ محافظ جیل کے ساتھ ہو لیا دروازے کے باہر دو اور سپاہی کھڑے تھے۔ ان سب کی معیت میں عدالت کی طرف روانہ ہوا آسمان نکھرا ہوا تھا۔ سورج کی شعاعیں بلند درختوں سے چھن چھن کر مختلف سمتوں پر پڑ کر اس منظر میں عجب دلفریبی پیدا کر رہی تھیں ———

خوب پیارا دن تھا۔

ہم کمرہ عدالت میں داخل ہوئے۔ میری آمد پر ہال عجیب و غریب آوازوں سے گونج اٹھا۔ تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز صرف میں ہی بدنصیب تھا۔ ہر طرف سے میری جانب انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ یہ نظارہ میرے دل و دماغ پر نشتر کا کام دے رہا تھا

میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ تو ہال پر پوری خاموشی چھا گئی۔ یہ دیکھ کر میرے دل کو بھی قدرے تسکین ہوئی اس وقت تک میں نے یہ بھی نہ سوچا۔ کہ میں یہاں اپنی قسمت کا فیصلہ سننے آیا ہوں۔ اگر خیال آیا بھی تو میں اس سے خوفزدہ نہ ہوا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں تازہ ہوا ہال میں بھر رہی تھی۔ ساتھ کے بازار سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز ——— خوشی کے نعرے اچھی طرح سے سنے جاتے تھے۔ سامنے جیوری کے ارکین بیٹھے تھے۔ مگر ان کے بشرے سے تو ایسا معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی کی موت کا فیصلہ سنانے والے ہیں

جب کہ میرے ارد گرد ایسا تسلی بخش ماحول تھا۔ تو پھر میں کسی ہولناک خیال سے کیوں ڈرتا۔ اگر میرے دل میں اس وقت کوئی خواہش تھی۔ تو صرف ایک آزادی کی، ــــــــ امید کی آخری کرن اب میرے دل میں نمودار ہو چکی تھی۔ اور میں اپنے فیصلہ کا ایک ایک لفظ سننے کیلئے تیار تھا۔ اب مجھ میں ایک بلا کی طاقت بدرجہ اتم موجود تھی

اسی اثنا میں میرا وکیل جس کی غیر حاضری سے ابھی تک کارروائی رکی ہوئی تھی نمودار ہوا۔ اور میرے قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ کر میری طرف جھکا۔ اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "کچھ فکر نہ کرو۔ مجھے امید ہے۔ کہ خدا بہتر کریگا"

میں نے بھی اسے اسی انداز میں جواب دیا۔ "یقیناً"

"مجھے ابھی تک ان کے فیصلہ کے متعلق کچھ علم نہیں۔ تاہم میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ وہ سزائے موت نہیں دیں گے۔ اب صرف حبس دوام کی بات ہے"

"آپ کا کیا مطلب جناب؟ میں تو موت کو ایسی ذلیل زندگی پر ترجیح دونگا" میں نے وکیل سے طیش میں آکر کہا۔

موت! ہاں موت! مجھے یہ کہنے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ سزائے موت تو آدھی رات کے وقت خوفناک ہال میں جس میں کہ گندی شمعیں جل رہی ہوں اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ سنائی جا سکتی ہے۔ مگر اس خوبصورت ہال میں اگست کے پر کیف مہینے میں آج ایسے خوشگوار اور سہانے دن اور ایسی شریف جیوری کے ہوتے ہوئے کیا سزائے موت سنائی جائیگی؟ نہیں! ہرگز نہیں یہ خیال کرتے وقت میری آنکھیں سورج کی منور صورت دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔

اتنے میں ریڈر نے کھڑے ہو کر میرا فیصلہ جو کہ جیوری نے میرے سوتے وقت مرتب کیا تھا سنانا شروع کیا۔ میرے تمام جسم میں خوف و ہراس کی ایک لہر دوڑ گئی میں نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ تاکہ زمین پر نہ گر پڑوں کیونکہ اب میری طاقت

جواب دے چکی تھی۔

"کیا آپ کو اس بارے میں کچھ کہنا ہے کہ کیوں نہ یہ سزا ملزم کو دی جائے"۔ صاحب صدر نے میرے وکیل سے دریافت کیا۔

مجھے بہت کچھ کہنا تھا۔ مگر میری زبان تالو سے چمٹ گئی۔ میں ایک حرف بھی زبان سے نہ نکال سکا۔

میرا وکیل کچھ کہنے کیلئے اٹھا۔ غالباً وہ میری سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرانے کی ناکام سعی کر رہا تھا میں چاہتا تھا۔ کہ اس کو روک دوں اور بھری عدالت میں پکار کر کہہ دوں "مجھے ہزار بار موت پسند ہے۔ میں عمر قید کیلئے جبہ سائی کرنا نہیں چاہتا" مگر یہ الفاظ میری زبان پر آکر رہ گئے۔ میں اپنے وکیل کا بازو پکڑ کر خفیف آواز میں صرف اتنا کہہ سکا "جانے دیجئے"۔

جیوری نے میرے وکیل کی سفارش پر کوئی کان نہ دھرا۔ بلکہ دوسرے کمرے میں تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر واپس آئے۔ اور میری موت کا فتوےٰ سنا دیا۔

"سزائے موت" ! ہجوم نے چلا کر کہا۔

میں نیم بیہوشی کی حالت میں ہجوم سے نکل کر باہر آیا۔ میرے اندر ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ سزائے موت کا حکم سنائے جانے سے پیشتر میں اوروں کی طرح ہوش و حواس میں تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مجھ میں اور دنیا میں اب ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ دھلا ہوا آسمان وہی اونچے اونچے درو دیوار وہی خوبصورت روشنی جو اس سے چند ساعت پیشتر میرے لئے موجب فرحت تھی۔ اب باعث اذیت ہے۔ وہی دلخوش کن سماں بھیانک، بے رنگ اور خوفناک جو آدمی میرے پاس سے گذر رہے تھے غول بیابان معلوم ہوتے تھے۔ سیڑھیوں کے نیچے قیدخانہ کی مہیب اور ڈراؤنی گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ دو نو عمر لڑکیاں

میری طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا ۔
"باجی! اس آدمی کو چھ ہفتہ کے بعد پھانسی دی جائیگی ۔ ہم بھی دیکھیں گے
خوب تماشا ہوگا۔"

(۳)

منزلِ موت!! کیا ہوا؟ کیا دنیا فانی نہیں؟ کیا ہر شخص کے لیے موت یقینی امر
نہیں؟ تو پھر خوفزدہ ہونا کیا معنی!
میری موت کا حکم سنانے سے اب تک کیا ان اشخاص کی اموات نہیں ہو چکیں
جو زندگی کو عزیز جانتے تھے!
کیا نوجوان۔ تندرست اور آزاد انسان نہیں مر چکے جو میرا سر قلم ہوتے ہوئے
دیکھنا چاہتے تھے؟
کیا اور شخص موت کے شکار نہ ہوں گے جو کہ اب تازہ ہوا میں آزادانہ چلتے
پھرتے ہیں؟
تو پھر زندہ رہنے سے مجھے کیا مل جائیگا جو میں اپنی موت پر اظہار افسوس
کروں ۔ اگر زندہ رہوں۔ تو سوائے اس کے کہ محافظ کا ہر روز منحوس چہرہ دیکھوں
ریت ملی ہوئی روٹی کو پانی جیسے شوربے سے زہر مار کروں جیل کے افسروں
سے دھتکارا جاؤں ۔ کسی ایسے شخص سے نہ مل سکوں۔ جس کے دل میں مجھ سے
بدبخت کا تھوڑا سا درد بھی ہوتا اور کہیں اس سے میں اپنا دکھ نہ بتا لوں ۔ اور کیا ہو سکتا
ایسی زندگی سے ـــــ ذلیل اور ناپاک زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔
آہ! یہ زندگی ناقابل برداشت اور ہولناک ہے ؛

(۴)

قید خانے کی سیاہ ماتمی اور منحوس گاڑی مجھے اس زندان میں لے آئی جس

ہیں کہ اب اپنی زندگی کے قلیل ایام بسر کر رہا ہوں۔
دور سے اگر دیکھو۔ تو یہ ایک عالیشان اور شاہی عمارت معلوم ہوتی ہے لیکن جوں جوں آپ نزدیک آتے جائیں گے۔ آپ کو افسوسناک حقیقت معلوم ہوتی جائے گی۔ اور شاہی عمارت ایک بدنما کھنڈر میں تبدیل ہو جائیگی جس کی کھڑکیوں میں شیشے کی بجائے آپ کو لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی نظر آئیں گی جن کے پیچھے آپ کو مجرموں کے بھیانک اور مردار چہرے نظر آئینگے یہ زندگی ہے۔ زندگی — جو موت کا بھیس بدل کر پھر رہی ہے۔

(۵)

اس جیل میں منتقل ہوتے ہی مجھ پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی گئیں کھانے کے ساتھ چھری اور کانٹے آنے بند ہو گئے۔ پہلا لباس اتروا کر چھوٹی قمیص پہننے کے لئے دی گئی صرف اسی خیال سے کہ میں خودکشی نہ کر لوں جیل کے محافظ اب میری زندگی کے ذمہ وار ہیں۔ کیونکہ میرا سر قلم کرنے کے لئے میری صحت اور زندگی لازمی ہے
پہلے دو تین دنوں میں انہوں نے ہر طرح میرے آرام و آسائش کا خیال کیا۔ میرے ساتھ تہذیب یافتہ شخص ایسا سلوک کرتے مگر مجھے یہ ظاہر داریاں بہت بری معلوم ہو رہی تھیں۔ میں خوب جانتا تھا۔ کہ یہ سب میرے سر کو کٹنے کے وقت تک محفوظ رکھنے کی خاطر کیا جا رہا ہے۔ ورنہ پھانسی کی کوٹھڑی کا محافظ دوسرے معنوں میں جلاد اور ایسی نرمیاں! خوش قسمتی سے ان دنوں میں ایک چاپلوسی سے مانوس ہو گیا ہوں اور جیل کے پادری نے مجھے ہفتہ میں ایک بار دوسرے قیدیوں کی معیت میں باہر جانے کی اجازت بھی دیدی ہے۔ لکھنے کا متعلقہ سامان بھی بڑی سوچ وچار کے بعد اب مہیا کر دیا گیا ہے۔ ہر اتوار کو دوسرے قیدیوں کیساتھ جیل کے صحن میں ٹہلتا ہوں وہ بدبخت بہت اچھے آدمی ہیں مجھے اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔ مگر

ان کی سرگزشت میرے لئے بھلا کیا دلچسپی رکھ سکتی ہے میرے لئے جس کی موت تھوڑے عرصہ بعد واقع ہونی ہو میرے لئے جس کے سر کو تھوڑے دنوں بعد دوسرے کا کھلونا بننا ہو۔ وہ گاتے ہیں راگ الاپتے ہیں۔ راگ غلیظ راگ جن کو سن کر میری ایسی حالت ہوتی ہے جیسے کوئی گرد و غبار سے اٹا ہوا قالین میری ناک کے قریب جھاڑ رہا ہو۔ لیکن با ایں ہمہ وہ مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

مجھے محافظ اور وارڈر سے بغض و عناد نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں، ہنستے ہیں۔ گویا میں ان کے لئے نئی چیز ہوں چڑیا گھر کا عجیب جانور۔

(۶)

جب تحریر کے تمام ذرائع مجھے میسر ہیں تو کیا وجہ ہے۔ کہ اپنے افکار و حوادث کو صفحۂ قرطاس پر نہ لاؤں لیکن مجھے کس موضوع پر قلم اٹھانا چاہئے؟ جبکہ جیل کی چار دیواری کے اندر میری مقید میری حد نظر دیوار سے اس پار نہیں جا سکتی میری نگاہیں نیلگوں آسمان کا تماشا نہیں کر سکتیں میرے ذہن میں ہمیشہ اور ہر وقت ایک ہی خیال موجزن ہے۔ موت کا خیال جب صورت یہ ہے۔ تو مجھے کیا لکھنا چاہئے مجھے اس دنیا سے کوئی سروکار نہیں میں اذیت رساں ذہن کے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر کیوں کر لا سکوں گا؟

کیوں نہیں؟ اگر میرا ماحول پُر سکون اور خاموش ہے۔ تو کیا اس سوال میں درد ہے میرے ذہن میں ہیجان ہے میری روح بیتاب ہے۔ میں جیتی جاگتی المناک داستان ہوں۔ کیا یہی ایک خیال مجھے میری داستان حیات بیان کرنے میں محرک نہیں ہو سکتا یہ خیال تو مقررہ وقت کو قریب سے قریب تر آتے دیکھ کر مزید تقویت پکڑتا ہے یقیناً تمام سامان مہیا ہے۔ میری زندگی مختصر سہی۔ تاہم وہ ایک انسان کی

بلا حسرت داستان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے ناکافی نہیں مصائب و نوائب میں مرنا سی صورت میں نمایاں کی واقع ہو سکتی ہے ۔ کہ میں اپنے زخم پنہاں کو ہویدا کروں میں اپنی ذہنی ہیجان کی تصویر کو انسانیت کے سامنے پیش کروں شاید ایسا کرنے سے میری تکالیف کی رفتار سست ہو جائے مجھے یقین ہے ۔ کہ میں جو کچھ لکھوں گا ۔ وہ بے سود نہ ہوگا ۔ میں اپنی مشکلات کی تکلیف دہ داستان اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک مکمل کرنے کی کوشش کروں گا ۔ اگر یہ غیر مکمل بھی رہ گئی ۔ تو کیا خونی حکایت سبق آموز ثابت نہ ہوگی !

اس شخص کی ذہنی کیفیت ، روحانی اذیت جسے موت کی سزا کا حکم سنایا جا چکا ہو ۔ ان افراد کیلئے بھی جنہوں نے سزائے موت کا فتویٰ صادر کیا ۔ سبق نہ ہوگا شاید اس حکایت کے تاثرات سے وہ مجرموں کی جانچ پڑتال نام نہاد ترازوئے عدل میں صحیح طور پر کر سکیں شاید وہ بتدریج ارتقائے مصائب کا بغور مطالعہ نہیں کرتے

جب وہ اپنی عدالت سے کسی مجرم کے خلاف موت کا حکم نافذ کرتے ہیں جب وہ کسی مجرم کو سزا دیتے ہیں ۔ تو اسوقت وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر رہتے ہیں کہ وہ جس شخص کی زندگی کا خاتمہ کرنیوالے ہیں ۔ اسکے اندر ایک غیر فانی روح موجود ہے جو موت کی دسترس سے بالاتر ہے ۔ انکے پیش نظر سوائے عدل و انصاف کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔ وہ مجرم کی اندرونی و بیرونی کیفیت سے بے پرواہ رہتے ہیں ۔

یہ کاغذات انہیں اس حقیقت سے آگاہ کر دیں گے ۔ شائع ہونیکے بعد میرے خیالات ان کے دماغوں کی عنان توجہ اپنی طرف منعطف کرائیں گے ۔ وہ انسانی جسم کو خاک میں ملا کر اپنی کامرانی کا دعوے کرتے ہیں ۔ ذہنی پستی کی عیاں مثال جسمانی اذیت ذہنی تکلیف کے مقابلہ پر کوئی اہمیت نہیں رکھتی ۔

وہ دن آنے والا ہے جب میرے سوانح حیات لوگوں کو ....

اگر میری زندگی کے بعد چیز ہوا ان کاغذات کو عدالت میں لے آئی یا یہ کاغذات

محافظ کے کمرہ کی بدنما کھڑکیوں پر جسپیاں ہو کر ابر و باراں سے ضائع ہو گئے۔

(۷)

فرض کر لیا جائے۔ کہ میری داستان زنداں ایک روز دوسروں کیلئے مفید ثابت ہو ——— ججوں کو سزائے موت کا فتوٰی دیتے وقت کپکپی پیدا کر دے ——— مجرموں اور بے گناہوں دونوں کو اس مصیبت سے جسمیں کہ میں آن دنوں گرفتار ہوں۔ بچالے تو مجھے اس سے کیا فائدہ؟ جب کہ میرا سر تیز دھار چھرے سے کاٹا جا چکا ہو گا۔ میں کسی خاموش قبرستان میں منوں مٹی تلے سو رہا ہونگا تو مجھے کیا، میری طرف سے وہ ہزاروں کی جانیں لیں۔ لاکھوں کے سر قلم کریں میں تو اسوقت اپنی زندگی کے در ـــ سے کر چکا ہونگا۔ کیا میں نے مقتل کی اس جگہ کو جس جگہ کہ میرے جسم کا خون بہیگا۔ اُلٹنے کی ناکام سعی کا خیال کیا ہے؟ جبکہ سورج کی زندگی بخش روشنی۔ بہار کا سہانا موسم ہرے بھرے کھیت۔ پرندوں کا چہچہانا نیلگون آسمان۔ لانبے درخت۔ برسات کی کالی کالی گھٹائیں۔ قدرت کی نیرنگیاں۔ زندگی اور موت میرے لئے نہ ہو گی۔ نہیں! نہیں! یہ سب کچھ میرے لئے ہے۔ میں زندہ رہونگا زندہ رہنے کی کوشش کروں گا۔

یہ ضروری ہے۔ کہ میں ضرور موت کے گھاٹ اُتار جاؤں گا؟ آہ! میرے پروردگار! اس خیال کے آتے ہی دیوار سے سر پھوڑنے کو جی چاہتا ہے:

(۸)

اب مجھے یہ سوچنا چاہئے۔ کہ میری زندگی اور موت کے درمیان کے روز باقی ہیں۔ تین دن سزائے موت کے حکم کے بعد ملزم کو رحم کی درخواست کیلئے ملتے ہیں ایک ہفتہ کاغذات کی جانچ پڑتال کیلئے ——— دو ہفتہ وہ کاغذات وزیر کی میز پر فضول پڑے رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا۔ کہ وہ کاغذ میں کس بارے

میں بحالانکہ مقدمہ کی تمام کارروائی اس کے پاس اسلئے بھیجی جاتی ہے۔ کہ وہ اس کا مطالعہ کرکے ان پر اپنی طرف سے رائے لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجدے ——

دو ہفتہ اس حکم کی نظر ثانی کرنے میں صرف ہوتے ہیں تاکہ کہیں کسی سے بے انصافی نہ ہوجائے ——

اس کے بعد شاہی عدالت کا اجلاس منعقد ہوتا ہے جسمیں وہ عموماً ان تمام درخواستوں کو رد کردیتے ہیں۔ جوان کی خدمت میں رحم کیلئے گذاری گئیں —— وہ ان ردی کاغذات کو وزیر کے پاس بھیجدیتے ہیں جو فوری عملدرآمد کیلئے انہیں جلاد کے سپرد کردیتا ہے۔

اب صرف تین دن باقی رہ گئے ——

چوتھے دن سرکاری وکیل اپنے دل میں کہتا ہے۔ "اس معاملہ کا جلد خاتمہ ہونا چاہئے چنانچہ اس کے حکم سے اسی صبح بازار کے چوک میں پھانسی دینے کا چبوترہ تیار ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ راہ گزروں کے لئے خونیں چبوترہ بہت دلچسپی پیدا کردیتا ہے —— اس کے بنتے وقت بہت سے تماشائی اس کے اردگرد جمع ہوجاتے ہیں۔

کل چھ ہفتہ ہوئے! زندگی اور موت کے درمیان صرف چھ ہفتہ!! اس بھولی لڑکی کا اندازہ بالکل درست تھا۔

(۵)

میں نے آج اپنی وصیت مرتب کرلی ہے۔ فضول ہے! میری تمام جائداد تو وکیل کے اخراجات بھی پورے نہ کرسکے گی پھانسی! پھانسی!! کبھی کتنی گراں ہے۔

میرے پسماندگان میں صرف ماں۔ بیوی اور بچہ ہوگا۔

ایک ننھی سی لڑکی تین سال کی معصوم بچی۔ جب میں نے اسے چھوڑا تھا۔ تو

وہ ابھی دو سال اور ایک ماہ کی تھی۔

چنانچہ میری موت کے بعد والدہ اپنا لڑکا، بیوی اپنا خاوند اور لڑکی اپنا باپ کھو بیٹھے گی۔ تین عورتیں مختلف شکلوں میں یتیم ہو جائیں گی۔

مجھے اپنی والدہ کا اتنا غم نہیں وہ بیچاری عمر رسیدہ ہے۔ اس دردناک واقعہ کی تاب نہ لا سکیگی۔ مر جائیگی۔ غم و اندوہ کی پے در پے تکالیف سے نجات پائیگی نہ مجھے اپنی بیوی کا ہی فکر ہے۔ وہ پہلے ہی سے صاحب فراش ہے یہ واقعہ اس کے عقل و ہوش کو چھین لے گا۔ میری یاد بھلا سے نہ ستائیگی۔

اگر فکر ہے تو اپنی ننھی معصوم بچی کا اس بھولی بھالی سی بیری کا جو اسوقت بھی اس ہونے والے حادثہ جانکاہ سے بے خبر گھر میں کھیل رہی ہوگی جس کے کان برائی کے لفظوں سے نا آشنا ہیں۔

آہ! صرف اسکی یاد مجھے بزدل بنائے گی۔

(۱۰)

میری تنگ و تاریک کوٹھری کا نقشہ بھی لگے ہاتھوں ملاحظہ ہو۔ یہ جگہ آٹھ مربع فٹ ہے۔ اس کی دیواریں سیمنٹ اور بجری سے کوٹی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں تھوڑی سی گھاس پڑی ہوئی ہے۔ یہ بدنصیب قیدی کے سونے کی جگہ ہے۔ خواہ کڑاکے کی سردی ہو یا جنون انگیز گرمی قیدی کو اسی جگہ بغیر کسی اوڑھنی کے سونا پڑتا ہے۔ میرے سر کے اوپر پتھر کی بنی ہوئی چھت ہے اور بجائے پردوں کے اس میں مکڑیوں کے جالے لٹک رہے ہیں۔

کھڑکیوں اور روشندانوں سے یہ کمرہ محروم ہے۔ سامنے بڑا سا آہنی دروازہ ہے جس کی شکل دیکھتے ہی بدن پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

نہیں! نہیں میں غلطی پر ہوں۔ دروازے کے اوپر ایک چھوٹا سا سوراخ

ہے۔ رات کے وقت یہ بھی احتیاطاً بند کر دیا جاتا ہے۔

یہ اُن غاروں یعنی کمروں کی تفصیل ہے جن میں میرے جیسے بد نصیب جنہیں سزائے موت کا حکم مل چکا ہو مقید ہیں۔

دن ہو یا رات۔ میرے کمرے کے باہر ہر وقت سنتری پہرہ دیتا ہے جب کبھی بھی اس طرف نگاہیں اٹھتی ہیں۔ اسی سنتری کا منحوس چہرہ نظر آتا ہے۔ جب دیکھو مجھے بڑی بڑی آنکھیں نکالے گھور رہا ہے۔

(۱۱)

رات کی سیاہی نے میری کوٹھڑی میں اندھیرا کر دیا تھا۔ آہ! مجھے دن کی روشنی کتنی پسند ہے۔

بیٹھے بیٹھے یہی خیال آیا۔ کہ کیوں نہ اپنی کوٹھڑی کی دیواروں کا جائزہ لوں اب وہی منحوس محافظ مجھے اندھی سی لالٹین دے گیا تھا۔

لالٹین لے کر اٹھا تو دیواروں پر بہت سی عبارتیں لکھی ہوئی معلوم ہوئیں۔ ان کے لکھنے میں کوئلہ پنسل اور کھریا مٹی استعمال کی گئی تھی معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہر اس بد نصیب شخص نے جو اس کوٹھڑی میں چند دن رہ گیا تھا۔ اپنی یادگار ان لفظوں میں چھوڑنی چاہی تھی۔

میرے بستر کے اوپر دو آتشیں دل بنے ہوئے ہیں جن میں ایک تیر پیوست ہے۔ ان کے نیچے "او بد نصیب! تیری زندگی کے دن بہت تھوڑے ہیں،" لکھا ہوا ہے۔ اور بہت سے دہکتے ہوئے دل۔ بہت غمناک اور دردناک عبارتیں سامنے دیوار پر ایک آزادی کا جھنڈا بنا ہوا ہے اس کے نیچے ملک کے ایک جان نثار کا نام کھدا ہوا ہے۔

آہ! میرے اللہ! میں نے تو سچ مچ خون بہایا تھا۔ قتل کیا تھا مگر اس

نے قوم اور وطن کی فلاح کیلئے قدم اٹھایا۔ پھانسی دیدی گئی۔ اس کے لئے بھی وہی خوفناک سزا تجویز کی گئی۔ یہ ظلم ہے۔ سراسر ظلم ہے
مجھ سے اب کچھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ میں نے ابھی ابھی اسی دیوار پر پھانسی کے چبوترہ کی شکل بنی ہوئی دیکھی ہے۔ کیسی ہیبتناک ڈراؤنی اور مہیب شکل ہے۔ اسی چبوترہ کی شکل جو میرے لئے بھی اس وقت تیار ہو رہا ہوگا۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں طاقت جواب دے چکی ہے۔ آہ! آہ! لالٹین میرے ہاتھ سے گر رہی ہے۔ بھائیو خدا کیلئے ذرا مجھے تھامنا!

(۱۲)

تنکوں کے بستر پر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا خوف وہراس دور ہوگیا۔ اور نامعلوم طاقت مجھے پھر دیواروں کی طرف لے گئی میں نے پھر انہی خوفناک عبارتوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ دیوار کے کونے میں کڑیوں کے جالے نئے مجھے کچھ لکھا ہوا سا نظر آیا۔ میں نے اس جالے کو ہاتھ سے پونچھ دیا۔ اس کے نیچے مجھے پانچ نام نظر آئے۔ میں ان کے لکھنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان میں پہلا شخص وہ تھا جس نے اپنے بھائی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا سر نالی میں اور باقی کا دھڑ دریا میں پھینک دیا تھا۔
دوسرا قیدی ایک حکیم تھا جس نے اپنے دوست کو زہر دیدیا تھا اور اس کا علاج کرتے وقت دوا دینے کی بجائے اسے زہر پلا دیا تھا
تیسرا ایک دیوانہ تھا خوفناک دیوانہ جو چھوٹے بچوں کو چاقو کی ایک ضرب سے ہی ہلاک کر دیا کرتا تھا۔
جب یہ خیال آیا کہ وہ سب کسی زمانے میں اسی کوٹھری میں موجود تھے تو میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

لیکن اب تو وہ جیل کے ملحقہ قبرستان میں خاموشی سے سو رہے تھے مجھے بھی ان کے ساتھ تھوڑے سے دنوں بعد جا ملنا ہے۔ میں توہمات کا قائل نہیں ہوں لیکن پھر بھی ان اشخاص کے حالات نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر دی میرے جسم کی حرارت تیز ہو گئی۔

میں ابھی ان پر قیاس آرائی ہی کر رہا تھا کہ یکایک معلوم ہوا۔ کہ وہ نام جو اس سونڑی دیر پر شیر بیشی کے لکھے ہوئے تھے۔ آگ کی طرح دہک رہے ہیں۔ ہر ایک لفظ ایک شعلہ معلوم ہوتا تھا جو میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا میرے کانوں میں عجیب عجیب آوازیں آنی شروع ہوئیں جو کہ تیزی کے ساتھ شور و غل میں بدل گئیں آنکھوں میں سے چنگاریاں نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اب مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ میرا کمرہ آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ بالکل نا آشنا ہیں ہر ایک اپنا سر ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہے جس میں سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ اب مجھ سے زیادہ نہ دیکھا جا سکا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ ہیبت ناک نظارہ اور بھی صاف دکھائی دینے لگا۔

خواب، واہمہ، حقیقت جو کچھ بھی ہو مگر اس وقت تو وہ مجھے پاگل بنا رہی تھی میں گرنے کے قریب تھا۔ کہ میں نے کسی ٹھنڈی سی چیز کو اپنے ہاتھ پر سرکتے دیکھا یہ مکڑی تھی جو کہ اس جالے سے گر پڑی تھی۔ اس واقعہ نے ان خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرے آوارہ اوسان پھر مجتمع ہو گئے۔

"معدوم، معدوم بڑی حفاظت سے اب زمین میں مدفون ا——

——مرقد—— در و دیوار سب بے نہار جیل..........

یہ کہہ کر میں نے لیمپ تیں لستی دی۔

——————

(۱۳)

طلوعِ آفتاب کے ساتھ جیل میں بھی ہنگامہ شروع ہوا۔ مجھے بھاری بھرکم آہنی دروازوں کے بند اور کھلنے کی آواز آئی قیدی ایک دوسرے سے ہمکلام تھے۔ میری ہمسائے قیدی بھی غیر معمولی طور پر مسرور تھے۔ جیل میں بہت زیادہ رونق تھی۔ ہر طرف خوشی خوشی نظر آتی تھی۔ تمام قیدیوں کے چہروں پر انبساط کے جذبات ہویدا تھے۔ صرف میں خاموش تھا۔ میں اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں سکوت سے اس تماشا کو دیکھ رہا تھا۔

محافظِ جیل میرے پاس سے گزرا میں نے جرأت سے دریافت کیا۔ "کیا جیل میں کسی جشن کی تیاری ہو رہی ہے؟"

"جشن؟ ہاں! اگر تم اسے یہ نام دے سکو۔ آج کے دن عمر قیدیوں کو طوق و سلاسل میں جکڑا جائیگا۔ کیونکہ انہیں کل طولون جانا ہے۔ کیا تم انہیں دیکھنا چاہتے ہو؟ یہ نظارہ میرے خیال میں تمہارے لئے باعثِ راحت ہوگا۔"

محافظ نے جواب دیا:

ایک تباہ شدہ اور واژگوں بخت انسان جسے تنہائی میں مقید رکھا ہو، اس کے نزدیک بدترین قسم کا اجتماع بھی قابل دید ہوتا ہے۔ میں نے محافظ کی دعوت کو قبول کر لیا۔

محافظ مجھے با احتیاط تمام ایک خالی کمرے میں لے گیا۔ کمرہ میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی سے انسان بیرونی حالات و واقعات کا بآسانی مطالعہ کر سکتا ہے۔ محافظ نے مجھے اس کمرہ میں بیٹھ کر قیدیوں کا تماشا دیکھنے کیلئے کہا

"تم اکیلے یہاں بادشاہ کی مانند مزے لو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کمرہ سے باہر چلا گیا۔ اور باہر سے کفل لگا دیا گیا۔

کھڑکی کے سامنے ایک بلند عمارت ہے جس کی چار دیواری سے رنج و غم ٹپک رہا ہے۔ انسان اسے دیکھتے ہی خائف و ہراساں ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ منظر انسانی چشم نہیں دیکھ سکتی اس عمارت میں انسانی روحیں مقید کر رکھی ہیں
آج کے دن کے تمام قیدی اپنے قیدی ...... اپنے بھائیوں کا تماشا دیکھنے کیلئے باہر آتے ہوئے ہیں .... ایسا معلوم ہوتا ہے۔
کہ مجروح روحوں نے دوزخ کی طرف ٹکٹکی لگا رکھی ہے !!
قیدی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو کی چشم ہائے شعلہ بار ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کر رہی تھیں بارہ بجے سب سے بڑا دروازہ کھلا۔ ایک بہت بڑی گاڑی اندر داخل ہوئی جس پر مسلح سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گاڑی عمر قیدیوں کے لئے تھی۔
اسی اثنا میں طوق جانے والے قیدی فوجی ضبط میں باہر نظر آئے ان کے دیکھتے ہی دوسرے قیدیوں نے شور مچانا شروع کیا۔
محافظوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ تمام قیدیوں کو بیڑیاں پہنائی گئیں قیدیوں نے ان آہنی زنجیروں کو بخوشی قبول کیا۔ اور کوئی پس و پیش نہ کی۔ ہر دلعزیز قیدیوں کو رخصت کے وقت ادب سے سلام کیا گیا جس کا جواب وہ نہایت متانت اور خندہ پیشانی سے دیتے رہے۔
اسی اثنا میں طبی معائنہ کیلئے ڈاکٹر آدھمکے۔ ان کی آمد پر قیدیوں نے آخری مرتبہ ناکام سعی کی۔ کہ وہ طوق نہ جا سکیں۔ بعض نے خرابی صحت کا بہانہ تراشا اور بعض نے آنکھ، پیٹ یا ٹانگ میں درد کا عذر پیش کیا لیکن ڈاکٹر وں کے سامنے ان کی ایک پیش نہ چل سکی۔ پھر وہ طیش بر جان درویش قیدیوں کو ان کے آہنی حاکم کے آگے سر جھکا دینا پڑا۔

اب قیدیوں کو نیم برہنہ کر دیا گیا۔ تاکہ طولون کے لئے انہیں مخصوص لباس پہنا دیا جائے۔ قیدیوں کے اجسام کا برہنہ ہونا تھا۔ کہ سرد ہوا زور سے چلنی شروع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سرد ہوا بھی آمادۂ انتقام ہے۔ بارش بھی خوب زور سے ہونے لگی۔

غریب قیدی کانپ رہے تھے۔ لیکن ان کی تکلیف کی کوئی پروانہ کی گئی اور ان کو مخصوص لباس پہنا دیا گیا۔ اور گردنوں میں آہنی کالر لٹکا دیئے گئے۔

کاروانِ جرائم روانہ ہو چکا تھا۔ میں تنہا کھڑکی میں بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہوں نے میری طرف رُخ کیا۔

"مجرم، قاتل، ہنستی موت" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ میں حیران و سراسیمہ تھا۔ کیا وہ میری طرف مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے؟

"الوداع شب بخیر" کہتے ہوئے سب آگے نکل گئے۔ ایک نوجوان قیدی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ خوش قسمت ہے۔ کیونکہ عنقریب اس کا خاتمہ ہونے والا ہے۔" شب بخیر رفیق من۔ میں کھڑکی میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ طولون جانے والے قیدیوں کا پانچواں گروہ میری کھڑکی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

آہنی زنجیروں کی آواز سے میرا قلب لرز رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوجِ شیاطین میری طرف بڑھتی آ رہی ہے۔ میں زور سے چیخا

اب مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں انسانی کھوپڑیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ اس خیال کی دہشت نے میرے قلب کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ میں نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو گیا۔

(۱۴)

جب میں ہوش میں آیا۔ تو اپنے تئیں ایک بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ سقفی لیمپ کی مدہم روشنی میں میں نے بستروں کو قطار در قطار دیکھا۔ تو اندازہ لگایا کہ میں دارالشفا میں ہوں۔ میں چند لمحات تک جاگتا رہا میں غور و فکر سے معرا تھا۔ یقیناً چند ایام پیشتر زندان کا یہی دارالشفا میرے لئے ہلاکت اور خطر کا سرچشمہ ثابت ہوتا۔

بستر اس قدر گندہ تھا۔ کہ تعفن سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ بہت معمولی قسم کے کمبل تھے۔ تاہم میں نے محسوس کیا۔ کہ میرے اعضا کے درد میں کمی واقع ہو رہی ہیں پھر سو گیا۔

اگلے روز بہت بڑے شور و غوغا نے مجھے خواب سے بیدار کیا۔ کیونکہ میرا بستر کھڑکی کے قریب تھا۔ اس لئے چیخ و پکار کا سبب تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ یہاں سے تقریباً تمام جیل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ طوتوں جانیوالے قیدیوں کو چھکڑوں میں سوار کیا جا رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے ان کے کپڑے تر بتر ہو رہے تھے۔ اور وہ سردی کے مارے اپنے گھٹنوں کو اندر کیطرف کئے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی بڑی ڈاڑھیاں بارش سے تر ہو چکی تھیں حسرت و یاس کا مرقع بنے ہوئے کانپ رہے تھے جولائی کے لباس میں دسمبر کی سردی کا مقابلہ کر رہے تھے۔

محافظ اپنے عصا کے آزادانہ استعمال سے ضبط و تنظم کو قائم کئے ہوئے تھے بے کس و لاچار قیدی ان کی آنکھوں میں آتش انتقام کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں یہ تھی ان کی انتہا !

میرے وکیل نے مجھے کیسی رائے دی تھی ؟ اُف ، میرے اللہ !!

موت ہزار بار بہتر ہے۔ اس زندگی سے ——— عمر بھر اسیری سے اس جہنمی زندگی سے ، موت اعلیٰ و ارفع ہے۔ آہ !!

(۱۵)

بدقسمتی سے میں اب تندرست تھا۔ اس لئے مجبوراً مجھے ہسپتال کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب وہی منحوس کوٹھڑی تھی۔ اور اس کی مرطوب دیواریں۔

تندرست ہوں! یقیناً تندرست ہوں۔ اس لئے کہ نوجوان ہوں۔ مضبوط ہوں۔ خون میری رگوں میں آزادانہ گردش کرتا ہے۔ میرے طاقتور بازو میری اطاعت کرتے ہیں۔ میرا جسم زیادہ عمر تک چلنے کے لئے بنا ہوا ہے۔ آہ! لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے مجھے ایک روگ ہے۔ بیماری ہے۔ جو مجھے روز بروز دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ یہ بیماری مجھے اپنے بھائیوں سے عطا ہوئی۔

جس دن ہسپتال سے خارج ہو کر اس منحوس چار دیواری میں آیا ہوں ایک خیال ہر وقت ستاتا ہے۔ خیال جو مجھے دیوانہ بنائے دیتا ہے، وہ یہ ہے۔ کہ اگر میں کچھ دن اور وہاں قیام کرتا تو...... شاید فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا!!

ان حکیموں، تیمارداروں اور نوکروں کی نظروں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ میری جوانی کو رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ان کی سرد آہیں۔ اُن کا ازراہِ شفقت میرا ہاتھ دبانا کیا اس پر دال نہیں ہے؟

کتنا تعجب ہے کہ وہ لوگ انسان کو بخار کی تکلیف سے تو بچا سکتے ہیں لیکن پھانسی کے حکم سے نہیں بچا سکتے جب کہ ان کیلئے ایسا کرنا بالکل آسان ہے۔ صرف دروازہ کھولنے سے ایک بدقسمت انسان کی جان بچ سکتی ہے صرف ایک دروازہ کھولنے!! اب میرے لئے تمام دروازے بند ہیں۔ موت سے بچنے کے لئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر رحم کی درخواست گزاروں۔ تو وہ مسترد کر دی جائیگی۔ کیونکہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ میرے خلاف پختہ ثبوت موجود تھے گواہوں کے بیان سچ پر مبنی تھے۔ لیکن کیا اگر نا سراسر بے وقوفی نہ ہے۔ حماقت ہے!!

کاش میں رحم کی درخواست منظور کرانے میں کامیاب ہوجاؤں مگر کس سے! کس بنا پر! اور کن ذرائع سے!

جب یہ سوچتا ہوں۔ تو ان سب کے جواب میں مجھے پھانسی کے چبوترے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نظر آجاتا ہے۔

اب میرے لئے صرف دو چیزیں باقی ہیں۔

اس منحوس کوٹھڑی میں چند روزہ قیام ——— گلا کاٹنے کا چبوترہ۔

(۱۶)

میں نے دار الشفاء کا تمام وقت کھڑکی میں بیٹھ کر گذار دیا۔ موسم تبدیل ہو چکا تھا۔ اور آفتاب کی جان بخش شعاعیں میرے لئے کسی حد تک لطف اندوز ثابت ہو رہی تھیں۔ اپنا بھاری سر ہاتھوں میں لئے کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹیکے پاؤں کو کرسی کے بازوؤں پر رکھے حسرت و یاس کی جیتی جاگتی تصویر نظر آرہا تھا۔ زندان کا خیال مجھے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا میرے اعضاء میں طاقت ہے ہی نہیں۔ کانوں میں ابھی تک ان قیدیوں کی زنجیروں کی آواز گونج رہی تھی۔

اس وقت میری انتہائی خواہش یہ تھی۔ کہ ریاض ہستی کا باغبان کسی خوش الحان طائر کو میرے بالمقابل کمرہ کے بام پر لا بٹھائے۔

میری دعا قبول ہو گئی جونہی میری زبان سے یہ الفاظ نکلے میں نے اپنی کھڑکی کے نیچے کسی کی صدا لئے ہوشربا سنی۔ یہ نغمہ کسی طائر کا نہ تھا۔ بلکہ کسی آتش نفس مغنیہ کا راگ تھا۔ جو دردناک ترنم میں اس کو گا رہی تھی۔

میں نے اپنے سر کو اٹھایا۔ تاکہ گانا سن سکوں۔ راگ فضا کو حسرت و الم کے جذبات سے لبریز کر رہا تھا۔

میں نے بلند شاہ بلوط کو کاٹا
مجھے شعلوں پر لوٹنے کیلئے کہا گیا

میں نے انسانی زندگی کا خاتمہ کیا
مجھے زنداں میں پھینک دیا گیا

میری رفیقہ حیات نے التجا کی
شاہ نے اسے نامنظور کر دیا

مجھے ایسے کمرے میں ناچ کرنا ہے
جو در و دیوار ، سقف و فرش سے عاری ہو

....

مجھے تختۂ دار پر لٹکنا ہے ۔

بس اب کچھ نہ سن سکا ۔

زنداں! آہ زنداں ۔ بدترین مسکن ، ذلیل ترین جاہ پناہ

جیل اپنی حد نظر تک کی اشیاء کو زہر آلود بنا دیتی ہے ۔ یہاں ہر خوبصورت چیز اپنی اصلیت اور حقیقت زائل کر لیتی ہے ۔ یہاں تک کہ ایک حسینہ کا آتشیں نغمہ بھی اور زنداں میں تمہاری نظر کسی ابر مدیر پر پڑے تو وہ بھی بے ردیالی بریدہ ہو گا ۔ اگر تم کسی خوشبودار پھول کو سونگھو تو اس میں تمہیں زہر کی خاصیتیں نظر آئیں گی ؛

(۱۷)

گر جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں تو کس طرح میں ہرے بھرے کھیتوں میں دوڑتا پھروں گا ۔

"نہیں، نہیں مجھے دوڑنا نہیں چاہئے۔ اس طرح تو لوگ مجھ پر شک کریں گے جیل سے بھاگا ہوا قیدی سمجھ بیٹھیں گے۔ میں آہستہ آہستہ سر جھکا کر چلوں گا۔ ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی سیٹی بھی بجاتا جاؤں گا اس طرح مجھے کوئی نہ پہچان سکے گا۔

جیل سے نکلتے ہی میں جیل کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں رات ہونے تک پناہ لوں گا۔ وہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ کبھی زمانے میں میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں مینڈک پکڑنے آیا کرتا تھا۔

جب پوری طرح تاریکی مسلط ہو جائیگی۔ تو میں وہاں سے نکل کر سیدھا انگلستان کی راہ لوں گا۔

ایک سپاہی میرے پاس گزر رہا ہے۔ اس نے مجھ سے پروانہ راہداری طلب کیا ہے۔ آہ! میرے پروردگار! میں تباہ ہو گیا۔

او۔ ہوا میں قلعہ بنانے والے پہلے اپنی منحوس کوٹھری کی تین فٹ چوڑی پتھر کی دیوار کو توڑ۔ آہ! ناامیدی!! موت!!! بھیانک موت!!!

مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت ایک کم عمر بچہ تھا جب میرا والد مجھے جیل کی دیوار دکھانے لایا تھا۔ مگر کسے معلوم تھا کہ میں اسی لوہے، اسی چار دیواری میں اس بے سروسامانی کی حالت میں قید کر دیا جاؤں گا۔ آہ!!!

(۱۸)

میں ابھی یہ لکھ رہا تھا۔ کہ میری لالٹین کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ دن کی روشنی اس روشنی پر غالب آ گئی تھی۔ مگر جا گھر کی گھڑی کی مدھم آواز چھ بجنے کا پتہ دے رہی تھی۔

دروازہ کھلا۔ محافظ جیل اندر داخل ہوا۔ ٹوپی اتار کر سلام کہتے ہوئے اس نے میرے تخلیہ میں مخل ہونے کی معافی چاہی۔ وہ میرا ہر روز ناشتہ لے کر آتا

مگر آج!

آج اس کے بشرے سے کچھ اور ہی ہویدا تھا۔

اپنی کرخت آواز کو ملائم بناتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چیز کھانا پسند کروں گا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی ــــ کیا وہ ـــــــ وہ خوفناک واقعہ کل پیش آنے والا ہے؟

(۱۹)

ایسا نرم سلوک صرف ایک دن کے لیئے ہے۔

جیل کا گورنر خود مجھے ملنے آیا۔ اس نے میرے آرام و آسائش کیلئے محافظ جیل کو کچھ ہدایات دیں۔ اس نے مجھ سے یہ بھی دریافت کیا۔ کہ میں اس سے ناراض تو نہ تھا۔ یا مجھے اس سے کوئی شکایت تو نہ تھی۔

شکایت اور مجھے! ـــ جس کی زندگی اور موت کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فاصلہ ہے۔ قریب المرگ انسان کو کسی سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے۔

واپس جاتے ہوئے اس نے بڑے ادب سے "جناب" کہا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ ایسا نرم سلوک صرف ایک دن کے لئے ہے

(۲۰)

محافظ جیل خیال کرتا ہے۔ کہ مجھے اس سے اور اس کے ہم پیشہ لوگوں سے شکایت نہیں۔ وہ درست خیال کرتا ہے۔

اُن کے بارے میں کچھ شکایت کرنی سراسر بے وقوفی ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔

وہ میری جان کی حفاظت کرتے رہے۔ کیا مجھے ان کا شکر گزار نہ ہونا چاہیئے!

لیکن محافظ ہنس مکھ، نرم الفاظ اور خوشامدانہ لہجہ رکھتے ہوئے بھی میری نظروں

ہیں جیل کی کوٹھڑی سے کم نہیں۔

میرے گرد و نواح کی سب چیزیں مختلف اشکال میں زنداں ہیں۔ یہ دیوار پتھر کا قید خانہ ہے، یہ دروازہ لکڑی کا جیل، قید خانہ! انسان اور چونے پتھر کی عمارت کا مرکب ہے۔ میں اسکا شکار ہوں۔ اس نے مجھے اپنی دیواروں میں قید کر لیا ہے۔ اس کے قفل مجھے فرار ہونے نہیں دیتے۔ اور یہ محافظ کی تیز بین نگاہوں سے میری حفاظت کرتا ہے۔

آہ! میں بد نصیب تو پہلے ہی سے ہوں۔ الٰہی! میرا کیا حشر ہوگا۔ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے!!

(۲۱)

اب مجھے کامل سکون حاصل ہو گیا ہے۔ تمام امیدوں کا خاتمہ ہو چکا ہے آج سے پہلے میرے دل میں امید کی آخری کرن باقی تھی۔ سو وہ بھی چلی گئی۔ خدا کا شکر ہے۔ ہزار بار شکر ہے۔ کہ امید کا وہ موہوم خیال جو میرے لئے سوہان روح ہو رہا تھا۔ اب باعث تکلیف نہ ہوگا۔ ساڑھے چھ بجے۔ نہیں! نہیں پونے سات بجے میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک معمر شخص اندر داخل ہوا۔ وہ بڑا سا لبادہ پہنے تھا میں نے اس کے لباس سے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی پادری ہوگا۔

وہ میرے مقابل چارپائی پر بیٹھ گیا مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھاتے ہوئے۔ اس نے کہا "میرے بچے! کیا تم تیار ہو؟"

"میں بالکل تیار ہوں" یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک سرد لہر میرے جسم میں سرعت سے دوڑ گئی۔ میری کنپٹیوں کی رگیں پھول گئیں اور کانوں میں شور برپا ہونے لگا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ پادری کچھ کہہ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے لب جنبش کر

تھے۔ اور وہ ہاتھوں سے کچھ اشارے کر رہا تھا۔

کوٹھڑی کا دروازہ پھر کھلا دو آدمی اور داخل ہوئے ان کے آنے سے میرے پراگندہ اور آوارہ خیالات پھر جمع ہونے شروع ہو گئے میں اب دیکھ اور سُن سکتا تھا۔ ان میں سے ایک جو ہاتھ میں بڑا سا کاغذ پکڑے ہوئے تھا میری طرف آیا اور جھک کر سلام کہنے لگا "جناب میں شاہی دربار کا نقیب ہوں اور حضور کے واسطے سرکاری وکیل کی جانب سے ایک پیغام لایا ہوں"

میری بے ہوشی اب بالکل دور ہو گئی تھی "پیغام لائے ہو خیر! اسے میرا سر ابھی بھی درکار ہے کیا؟ مجھے امید ہے۔ کہ میری مرگ سے اُسے بہت خوشی حاصل ہو گی۔ کیوں نہ ہو بیچارے نے اس کی خاطر تھوڑی تکلیف اُٹھائی ہے" یہ کہہ کر میں نے آواز کو اور مضبوط بنایا۔ اور کہا جناب اس پیغام کو پڑھ کر سنا دیجیے۔

اس پر اس نے وہ کاغذ پڑھنا شروع کیا۔ جو شروع سے آخر تک بڑے بڑے لفظوں سے پُر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ میری درخواست رحم شاہی دربار نے مسترد کر دی ہے۔ اور پھانسی اسی دن عمل میں لائی جائے گی۔

"آپ ببر سے ساڑھے سات بجے تشریف لے جائیں گے۔ کیا؟" اس حکم کو پڑھنے کے بعد مودبانہ لہجہ میں کہا۔

کچھ دیر تک تو میں اس کو بالکل نہ سن سکا۔ کیونکہ جس وقت اس کی آنکھیں کاغذ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ اس وقت میں دروازے کی طرف پرامید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن آہ! بدقسمتی!! ایک نہیں چار سنتری کمرے کے باہر پہرہ دے رہے تھے۔

شاہی ہرکارہ نے پھر وہی سوال دُھرایا تو میں نے آہستگی سے جواب دیا جیسے آپ کی مرضی ہو۔ میں ہر وقت تیار ہوں۔"

"تو پھر میں نصف گھنٹے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ تیار رہیے آپ"
ہرکارے نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا:"

وہ سب مجھے تنہا اس منحوس کوٹھڑی میں چھوڑ کر چلے گئے۔

کاش! میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں میرے پروردگار! کوئی ذریعہ مہیا کردے۔ کہ میں یہاں سے بھاگ نکلوں۔

مجھے فرار کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور پیدا کرنا چاہیے۔ وہ دروازے سے ہو یا چھت سے مگر کھڑکیوں سے ہو یا زمین سے۔ مگر مجھے یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیے خواہ ایسا کرنے میں مجھے اپنا گوشت ہی قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔

ایسا خیال کرنا سراسر بے وقوفی ہے۔ جہالت ہے۔ بہترین ہتھیاروں کی مدد سے بھی اگر اس دیوار کو توڑنے لگیں۔ تو بھی تین ماہ کے عرصہ سے کیا کم وقت خرچ ہو گا۔ مگر مجھے جس کے پاس ایک کیل تک نہیں۔ ایک مکمل گھنٹہ تک وقت نہیں۔ آہ! ظالم شیطانو!! سفاکو!!! میں پاگل ہو رہا ہوں!!!!

(۲۲)

اب اس جگہ منتقل کر دیا گیا ہوں۔ اب صرف ایک اور صرف ایک چیز باقی ہے یعنی گلا کاٹنے کی مشین دوران انتقال میں جو سفر طے کیا۔ وہ اس قابل ہے۔ کہ صفحہ قرطاس پر لایا جاتے۔

پورے ساڑھے سات بجے سرکاری ہرکارہ بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو کر یوں گویا ہوا۔

"جناب میں حضور کا انتظار کر رہا ہوں"

میں اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میری طاقت بالکل سلب ہو چکی ہے۔ سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ جسم کے تمام اعضاء

بالکل مردوں جیسے تھے دوسرا قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔

مگر میں نے بڑی جرأت سے کام لیکر اپنی زائل شدہ طاقت پر فتح پانے کی کوشش کرتے ہوئے دروازہ کی جانب بڑھنا شروع کیا۔

اس منحوس کوٹھری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے سے پیشتر میں نے اس پر آخری نگاہ ڈالی جس میں میری زندگی کا قلیل مگر اہم حصہ گزرا تھا وہ اب بالکل سنسان معلوم ہو رہی تھی ——— زندان کی کوٹھری کیلئے خالی رہنا بھی تعجب سے کم نہ تھا۔ غلام گردش کے اختتام پر ہمیں جیل کا پادری ملا۔ اور ہمارے ساتھ ہو لیا۔

زندگی کے درمیانی دروازہ پر ڈائرکٹر مجھے بہت محبت و شفقت سے ملا۔ اور خاص میری حفاظت کے لیے چار آدمی متعین کر دیئے دروازے سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھا قیدی اپنے پنجرے سے بولا۔ آئندہ ملاقات تک خدا حافظ! کتنی مضحکہ خیز الوداع تھی۔ شاید وہ بوڑھا نہیں جانتا تھا کہ یہ سفر جو میں اب اختیار کر رہا ہوں میرا آخری سفر ہے۔ آئندہ ملاقات عالم بالا میں ہو سکتی ہے۔ اب ہم صحن میں پہنچ گئے جہاں کہ میں آزادانہ طور پر کھلی فضا میں سانس لے سکتا تھا۔ لیکن میں اس فضل سے بہت دیر تک لطف اندوز نہ ہو سکا۔ کیونکہ دروازے کے باہر ہی منحوس گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی جس سے ایک دفعہ پہلے بھی میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس متحرک قبر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے صحن پر نگاہ ڈالی ——— وہ نگاہ جو کسی اچانک شعبدہ کی طالب تھی —

میری روانگی پر تماشائیوں کا اچھا خاصا گروہ گاڑی کو حلقہ بنائے ہوئے تھا ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی جو موسم کو اور شاداب و دلنشیں بنا رہی ہے۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہرکارہ اور ایک محافظ سامنے والی نشست پر میں پادری اور دوسرا محافظ اس کے مقابل بیٹھے پر اس کے علاوہ چار اور محافظ گاڑی کے پائیدان پر کھڑے تھے کوچوان کو شمار نہ کرتے ہوئے ایک کے مقابلہ میں آٹھ تھے گاڑی خوفناک گڑگڑاہٹ

ـــ متحرک ہوئی۔ اور زندان کے بھاری بھرکم دروازے بند ہو گئے

میں اس آدمی کی طرح تھا جو بیہوشی کے عالم میں ہی زندہ درگور کیا جا رہا ہو جو سن سکتا ہو۔ مگر طاقت گویائی نہ رکھتا ہو۔

گھوڑوں کی گھنٹیوں کی آواز کوچوان کی چابک کی فرسٹر اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ مجھے اس خوفناک منظر کی طرف تیزی سے لے جا رہی تھی۔ میں خدا جانے کن خیالات میں غرق تھا۔ کہ اچانک گاڑی نے رخ بدلا۔ آہنی سلاخوں والی کھڑکی میں باہر کی طرف جھانکا۔ تو لوترسے ڈیم کے بلند مینار نظر پڑے۔ جو کہ پیرس کی دھند میں دھندلے دھندلے سے نظر آ رہے تھے۔

اس منظر کو دیکھ کر میرے خیالات یک لخت لوترسے ڈیم کی طرف پلٹ پڑے جو لوگ اس مینار پر موجود ہوں گے۔ وہ میری گردن اترنے کا منظر بخوبی دیکھ سکیں گے میں نے مجنونانہ ہنسی ہنستے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

اسی وقت پادری نے بھی مجھ سے کچھ کہا۔ میں نے اسے اطمینان سے بولنے دیا کیونکہ میرے کان تو پہلے ہی سے گاڑی کے پہیوں، کوچوان کی چابک اور گھوڑوں کی متواتر آوازوں سے پر تھے۔ اس لئے پادری کی آواز میرے لئے ان شور میں ایک شور تھی۔ میں خاموشی سے اس کی رٹی ہوئی آواز سنتا رہا۔ جو میرے احساسات قلب کو مردہ کر رہی تھی ———— اس کی وعظ اس ندی کے شور کے مشابہ تھی۔ جو کسی ویران جنگل میں بہ رہی ہو۔ میں نے اس کو سنا۔ مگر آہ! وہی الفاظ وہی عبارت اصنوبر کے بڑھے اور مٹے ہوئے درختوں کی طرح میرے لئے نئے نہ تھے۔ میں انہیں کئی مرتبہ سن چکا تھا بجائے اثر کرنے کے وہ میرے خیالات کو اور مجروح، پریشان اندر آزادہ کر رہے تھے۔

یکایک سرکاری ہرکارہ کی درشت آواز نے مجھے اپنے گہرے خیالات سے چونکا

دیا۔ وہ پادری سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔

موسیو آپ نے سنی۔ آج کی تازہ خبر؟ اس نے مجستانہ لہجہ سے کہا۔ پادری جو کہ میرے ساتھ وعظ و نصیحت میں مصروف تھا۔ اس کو نہ سن سکا۔ لہذا ہرکارہ نے پھر ایک دفعہ اس سے مخاطب ہو کر کہا:

مقدس باپ! کیا آپ کو اس تازہ خبر کا علم ہے جس نے آج پیرس بھر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے

میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ کیا اس خبر کو میرے ساتھ تعلق تھا۔ مجھے بھی تو آج ....

"نہیں تو! مجھے صبح سے اخبار دیکھنے کا وقت نہیں ملا۔ شام کو سارے اخبار ایک بار ہی دیکھ لونگا۔ پادری نے آخر کار جواب دیا۔ "جو خوشی میں کچھ اور عرض کر رہا ہوں جناب آج کی تازہ خبر وہ خبر جس نے پیرس بھر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔" ہرکارہ نے اسی انداز سے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے اس کا علم ہے" میں نے ہرکارہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں؟ کیا واقعی! ہاں تو اس معاملہ کی بابت تمہاری کیا رائے ہے؟"

"معاف کیجئے۔ میں کچھ اور سمجھا تھا" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس خبر کا میرے وجود کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا"۔

"لیکن تم تو ابھی کہہ رہے تھے۔ کہ تمہیں کسی خبر کا علم ہے آخر وہ کیا ہے؟" ہرکارے نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنے کاندھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر پھر اپنے خیالات میں غوطہ زن ہو گیا۔

ابھی چند منٹ نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ ہرکارہ پھر ایک دفعہ مخاطب ہوا۔ "اللہ

کہنے لگا "کیا سوچ رہے ہو تم؟"

"اپنی قسمت کے فیصلہ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ کہ آج شام کے بعد میں کچھ سوچ نہ سکوں گا"

"یہ بات چھوڑو۔ چھوڑو۔ ان خیالات کو موقوف کردو۔ تم تو بہت غمگین ہو رہے ہو۔ نوجوان آدمی! بہادر بنو۔ اور اس کا مردانہ وار مقابلہ کرو ــــــــ"

"نوجوان! میں اور نوجوان! بھول رہے ہیں۔ آپ۔ میری عمر آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک ایک منٹ میری عمر میں سال بھر کا اضافہ کر رہا ہے"

"دیکھو! تم مذاق کر رہے ہو۔ میں تمہارے دادا کی عمر کے برابر ہوں"

"میں حقیقت عرض کر رہا ہوں مجھے آپ سے مذاق کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی"

"جناب خفا ہوں آپ رنجش کو تھوک ڈالئے" اس نے میری سنجیدگی سے متاثر ہو کر کہا۔

"وہ رنجش دیر تک قائم نہ رہیگی بخاطر جمع رکھیں" میں نے جواب دیا۔

ہماری گفتگو گاڑی کے اچانک ٹھہر جانے سے بند ہو گئی۔ گاڑی محکمہ چونگی کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ ایک انسپکٹر آیا۔ اور اس کا معائنہ کر کے چلا گیا اگر گاڑی میں ہماری بجائے قربانی کی بھیڑ ہوتی تو وہ یقیناً محصول کی دستبرد سے محفوظ نہ رہتی ــــ گاڑی چل پڑی۔

گرجا گھر کا گجر ساڑھے آٹھ بجا رہا تھا۔ کہ ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے عدالت کی عمارت ہی میری روح قبض کرنے کیلئے کافی تھی۔ مگر میں غیر معمولی جسارت سے کام لیتے ہوئے۔ گاڑی سے اترا۔ اور سپاہیوں کی دو رویہ قطار سے گذرتا ہوا۔ اس عمارت میں داخل ہو گیا۔

(۲۳)

شاہی ہرکارہ کی معیت میں گیلری سے گزرتا ہوا ڈائرکٹر کے کمرے میں پہنچا تو یہ وہ گیلری ہے جس سے صرف وہی شخص گذرتے ہیں جن کو سزائے موت جیسا لرزہ خیز حکم سنایا جا چکا ہو۔ دوسرے الفاظ میں جن کا گلا تھوڑے سے عرصہ کے بعد بریدہ کیا جاتا ہو۔ ہرکارہ بحفاظت تمام مجھے ڈائرکٹر کی نگرانی میں چھوڑ گیا جس نے مجھے اپنے ملحق کمرے میں بند کر دیا۔ اور باہر سے کمرے کو مقفل کر دیا۔

میں خدا جانے کن خیالات میں مستغرق تھا۔ نہ معلوم اس کمرے میں کتنے عرصہ سے موجود تھا۔ کہ یکایک کسی انسانی قہقہہ نے مجھے اس وارفتگی سے چونکا دیا۔

میں نے فوراً ہی اپنی نگاہیں اٹھائیں تو اس حقیقت سے آشنا ہو گیا کہ میں کمرہ میں اکیلا نہ تھا بلکہ میرے سامنے پچاس اکیس برس کا متوسط قد آدمی کھڑا میری طرف تیز اور چمکتی ہوئی نگاہوں سے گھور رہا ہے۔

اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا۔ جسم بے حد کثیف اور گندہ۔ اس کی موجودہ ہیئت کذائی عجیب گھناؤنا منظر پیش کر رہی تھی۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ میری بے خودی کے عالم میں یہ بدنصیب شخص اس کمرہ میں ٹھونسا گیا تھا ـــــ کاش موت کا فرشتہ ہی اس کی جگہ آ گیا ہوتا۔!!!

ہم تھوڑی تھوڑی دیر کیلئے ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے رہے مگر میرا تعجب اور خوف لحظہ بہ لحظہ بڑھتا گیا۔ کیونکہ وہ اس دوران میں پہلے سے زیادہ خوفناک اور شیطانی قہقہے لگا رہا تھا۔

"تم کون ہو"۔ بالآخر میں نے اس سے دریافت کیا۔

میں؟ میں وہ شخص ہوں جس کے سر کو آج سے ٹھیک چھ منٹ بعد دوسروں کا کھلونا بننا ہے۔ اپنی طرح ہی سمجھو۔ خوشی آتا ہے۔ کہ تمہارا سر چھ گھنٹے کے بعد قلم

ہوگا۔ اور میرا چھ مہینہ کے بعد"۔ اس بڈھے نے شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے سر دلہر تمام جسم میں بجلی جیسی سرعت سے دوڑ گئی۔ تو یہ میرا وارث تھا — میری جھونپڑی نما کوٹھڑی کا وارث۔

"کوئی فکر مت کرو اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنے سوانح حیات سنانے شروع کیے"۔

میں ایک مشہور چور کا بیٹا ہوں۔ بدقسمتی سے ایک دن میرے باپ کو جلاد سے واسطہ پڑ گیا۔ جس نے اسکی گردن کو پھانسی کے پھندے میں دیدیا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب کہ خدا کے فضل سے پھانسی کی سزا رائج تھی۔

چھ سال کی عمر میں میں نے اپنے آپ کو بالکل خانماں برباد پایا۔ والد تو اسطرح مر گیا۔ والدہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ متواتر تین سال تک سڑکوں پر بھیک مانگتا رہا۔ مجھے اس غرض کیلئے ننگے پاؤں بیسیوں میل سفر کرنا پڑتا۔ اور کیچڑ میں گھٹنوں تک گھسنا پڑتا۔ میرے تن پر صرف چیتھڑے چیتھڑے تھے۔ میری کمزور ٹانگیں پتلون سے بخوبی نظر آسکتی تھیں۔ سردیوں کے دنوں میں اپنا لنج شدہ جسم لوگوں کو دکھاتا۔ لیکن افسوس اس طرح کچھ حاصل نہ ہوا۔

نو سال کی عمر میں یعنی تین سال کے بعد اس پیشہ سے تنگ آکر اٹھائی گیری شروع کی۔ لوگوں کی جیبیں خالی کیں۔ شروع میں شبہ پڑا یا۔ ایک سال کے بعد میں پورا جیب کترا بن گیا۔

تب میں نے اپنی واقفیت بڑھانی شروع کی حتے کہ میں ستر برس کی عمر میں ایک ڈاکو بن گیا۔ اسی زمانہ میں ایک قفل توڑتے وقت گرفتار ہو گیا۔ اور قیدخانہ میں سزا کے ایام بھگتنے لگا۔

کسقدر ذلیل زندگی ہے جیل خانہ کی خالی تختوں پر سونا۔ ریت ملی ہوئی روٹی زہر مار

کرنا اور محافظوں کی چابکیں ننگے بدن پر کھانا۔ ان تکالیف کا وہی اندازہ لگا سکتا ہے جسے اس منحوس جگہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔

خیر قہر درویش بجان درویش میں نے اپنی سزا کے پندرہ برس —— اس کا خیال کرتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس گھناؤنی جگہ بسر کیے۔

قید خانہ کو خیر باد کہنے سے پیشتر انہوں نے میری سہولیت کیلئے ایک نقشہ اور پروانہ راہداری دیا۔ اس کے علاوہ مجھے چھیاسٹھ فرانک بھی دیئے گئے جو میری پندرہ سالہ محنت اور مزدوری کا معاوضہ تھے۔ سولہ گھنٹہ فی دن تیس دن فی مہینہ اور بارہ ماہ فی سال عرق ریزی کا معاوضہ!!!

اس منحوس جگہ سے نکلتے ہی میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ اب نیک زندگی بسر کروں گا اس قلیل رقم پر ہی اکتفا کروں گا۔ اس وقت ان چیتھڑوں میں ملبوس میرے پہلو میں ایسا دل تھا۔ جو آپ کسی پادری کے لمبے اور شاندار چغے میں نہیں پا سکتے مگر ہائے حسرتا!

اس زرد رنگ پاسپورٹ کا ستیاناس ہو۔ اس پر "رہا شدہ مجرم" ایسے خوفناک الفاظ جلی قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ جہاں کہیں بھی جاتا، یہ منحوس کاغذ میرے نامۂ اعمال کی طرح ہر شخص پر میری شخصیت کو واضح کر دیتا۔ اپنی نوعیت کی ایک سفارش تھی —— "رہا شدہ مجرم" یہ الفاظ ہی لوگوں کو مجھ سے متنفر کرنے کیلئے کافی تھے

وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔ میری شکل سے ہی لوگ خوفزدہ ہونے لگے مجھے دیکھتے ہی بچے ڈر کے مارے بھاگ جاتے۔ لوگ مجھے دیکھتے ہی اپنے دروازے بند کر لیتے۔ یہ حال تھا۔ تو ملازمت کی توقع رکھنا سراسر بے وقوفی تھی۔ وہ قلیل رقم اب بالکل خرچ ہو چکی تھی۔ ہر ایک کو اپنے مضبوط اعضا مزدوری کی توقع پر دکھلائے۔ مگر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے دن بھر کی مزدوری چند اور لگے دس پیسے۔ پانچ پیسے پر کرنی قبول کی

انہوں نے میری فریاد پر کان نہ دھرا۔ اب مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر پیٹ پوجا بھی تو ضروری تھی۔

تین دن کی فاقہ کشی سے تنگ آ کر آخر ایک روز نانبائی کی دوکان پر سے روٹی چرانی چاہی مگر نانبائی نے مجھے پکڑ لیا۔ اور پولیس کے حوالے کر دیا۔

کھانا تو در کنار میں نے روٹی کو چھوا تک بھی نہ تھا۔ مگر عمر بھر کیلئے اسیر کر دیا گیا اور تین حرف میرے کاندھوں پر داغ دیئے گئے چاہو تو دکھا دوں؟

اس اسیری کی صعوبتیں اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔ اس لیئے یہاں سے بھاگ نکلنے کا تہیہ کر لیا۔ میرے پیش نظر صرف تین دیواریں اور وہ آہنی زنجیریں تھیں۔ میرے پاس صرف ایک کیل تھی۔ مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور وہاں سے بھاگ نکلا

اب کی دفعہ اس زر در پروانہ راہداری کی لعنت تو نہ تھی۔ مگر پیسہ نام تک کو نہ تھا۔ راستہ میں مجھے چند دوست مل گئے۔ جو سب میری طرح ہی تھے یعنی فراری۔ اس گروہ نے مجھے دعوت شمولیت دی جسے میں نے قبول کر لیا۔

عرصہ تک ہم لوگوں کے جان و مال پر اپنی شکم پری کیلئے ڈاکہ ڈالتے رہے۔ لیکن اب میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ میری تلاش میں سپاہی مصروف عمل تھے میں جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر اپنی جان بچاتا۔ مگر پھر بھی آزاد تھا۔ اپنا آقا آپ تھا۔ اس ذلت آمیز زندگی سے یہ ہنگامی زندگی ہزار درجہ بہتر تھی۔

کہ ہر ایک چیز فانی ہے وہ دور عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ ایک دن بوڑھا اور ضعیف ہونے کے سبب بھاگ نہ سکا۔ پکڑا گیا۔ اور اب اس جگہ لایا گیا ہوں۔

اس بوڑھے کی کہانی سن کر میں بہت حراساں اور پریشاں ہو گیا۔ وہ اب ہنس رہا تھا۔ نہیں نہیں زور سے قہقہہ لگا رہا ہے۔

اسی اثنا میں وہ میری طرف ہاتھ ملانے کیلئے بڑھا مگر میں ہمت کر کے دوسری طرف

ہٹ گیا۔

دوست! تم تو مجھ سے خوفزدہ ہو رہے ہو۔ کہیں ایسا اس چبوترہ پر نہ کہنا کاش! میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا۔ خیر ایک ہی بات ہے۔ آج نہیں تو کل سہی لیکن تم میرے دوست نہ بنو گے۔ کیا!۔

"جناب یہ آپ کی عنایت ہے۔" میں نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

"آہا! آپ تو کوئی مارکوئیس معلوم ہوتے ہیں۔" اس شیطان نے میرے جواب پر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! مجھے اپنے حال پر ہی چھوڑ دو میں خدا جانے کن خیالات میں غرق ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میری سنجیدہ گفتگو نے اس پر کچھ اثر کیا۔ اور وہ کچھ عرصہ تک اپنے گنجے سر کو کھجلاتا رہا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد پھر گویا ہوا۔

"جناب آپ امیر آدمی ہیں۔ آپ کے پاس جو یہ بڑا کوٹ ہے۔ آپ کے کسی مطلب کا نہیں۔ اگر مجھے عنایت کر دیں تو میں اسے تمباکو خریدنے کیلئے بیچ دونگا۔"

میں نے اپنا کوٹ اتارا اور اسے دیدیا۔ اس پر وہ بچوں کی طرح ناچنے لگا فرط انبساط سے زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ مگر اچانک میری طرف دیکھ کر بولا۔

"جناب آپ تو کانپ رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اپنی بھدی اونی جیکٹ اتار کر مجھے پہنا دی۔ جو کچھ بھی ہوا۔ سب بیخودی کے عالم میں میں دیوار کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی حرکات و سکنات کو بغور معائنہ کرنے لگا۔ وہ میرے کوٹ الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اور بہ ملاحظہ کے بعد خوشی کا نعرہ مارا۔

"جیبیں بالکل نئی ہیں۔ کالر بدستور ویسا ہی ہے۔ اسے فروخت کرنے سے کم از کم پندرہ فرانک حاصل ہوں گے۔ کتنا خوش نصیب ہوں۔ چھ ہفتہ تک تمباکو

ہے کہ مجھے یقین نہیں آتا!"

دروازہ پھر کھلا وہ البا اس لئے آئے تھے۔ کہ مجھے اس کمرہ میں پہنچا دیں جہاں کہ مجرم اپنی زندگی کے چند آخری لمحات گذارتا ہے۔ اور اس بوڑھے کو اس جگہ پہنچائیں جسے میں خیرباد کہہ آیا تھا۔

(۲۴)

وہ بوڑھا بدمعاش مجھ سے بڑا کوٹ چھین کر لے گیا چھین کر اسلئے کہ میں نے اسے وہ برضا و رغبت نہ دیا تھا۔ اس کی بجائے یہ بدنما و بدبودار چیتھڑا دے گیا۔ ہے جس کی شکل سے ہی مجھے نفرت ہے۔ اس ہئیت کذائی میں لوگ مجھے کیا سمجھیں گے میں نے وہ کوٹ خیرات کے طور پر نہ دیا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ مجھ سے طاقتور تھا مجھ سے کہیں زور آور تھا۔ اگر میں کوٹ دینے میں پس و پیش کرتا۔ تو وہ یقیناً مجھے کاٹتا میری بوٹیاں نوچ ڈالتا۔ یہ ہے ناتواں اور طاقتور میں فرق۔ آج اُسے ایک موقع مل گیا۔ اور اس نے اس سے فائدہ اٹھایا لیا شائد وہ اس سے خوش ہو گیا ہو مگر! مگر! وہ کچھ بھی ہو میں حیران ہوں کہ آخر یہ ذلت میں نے برداشت کس طرح کی۔ اگر وہ اب میرے سامنے آئے۔ تو میں اسے پاؤں تلے روند ڈالوں کھا جاؤں ظالم! سفاک! کمینہ!

میرے دل میں غصہ و انتقام کی لہر دوڑ رہی ہے۔

جیل خانہ خصوصاً مرنے سے موت ایسا ہیبت ناک خیال آدمی کو چڑچڑا اور عفیل بنا دیتا ہے۔

(۲۵)

مجھے انھوں نے اس بدنما کوٹھڑی میں دھکیل دیا ہے جس کے اندر مجھے سوائے مرطوب دیواروں یا لوہے کی موٹی بڑی سلاخوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا

میں نے کُرسی و میز اور لکھنے کا سامان مانگا۔ وہ مجھے دیدیا گیا۔ مگر جب میں نے بستر کیلئے درخواست کی تو وہ حیران ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ مگر بہت غور و خوض کے بعد وہ بستر اور چارپائی لے آئے۔ مگر کیا دیکھتا ہوں۔ کہ بستر کے ساتھ ہی اور شخص بھی چلا آ رہا ہے۔ یہ میری جان کا محافظ ہے انہیں ڈر ہے۔ کہ کہیں میں بستر کی چادر سے اپنا گلا نہ گھونٹ لوں!

(٢٦)

اب دس کا عمل ہے۔

آہ میری پیاری بچی صرف چھ گھنٹے کا قلیل عرصہ باقی ہے۔ اس کے بعد میں مر جاؤں گا بالکل بے ہوش اور غافل ہوں گا۔ میرا جسم کسی ہسپتال کی ٹھنڈی میز پر پڑا ہو گا۔ ایک فریق کے پاس میرا سر ہو گا۔ اور دوسرے کے پاس میرا دھڑ جس پر بہت بے رحمی سے عمل جراحی کیا جائیگا۔ اور جب وہ کسی کام کا نہ رہیگا۔ تو کسی گڑھے کے سپرد کر دیا جائے گا۔

تیرے والد کے ساتھ یہ حالت ہو گی۔ میری بچی کیا سنتی ہو۔ تیرے پیارے والد کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیا جائیگا ان اشخاص کے ہاتھوں سے یہ چیزیں عمل میں آئیں گی جو مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن کی میرے ساتھ کوئی عداوت نہیں جو مجھے موت سے بچا سکتے ہیں۔ وہی اب موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں محض قتم کر رہے ہیں۔ صرف اس خاطر کہ دوسروں کیلئے تجربہ عبرت ہو۔ آہ! میرے خدا! بھولی لڑکی! تیرا باپ تجھے جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے جو تیری ننھی سی سپید گردن کو ہر روز بوسہ دیا کرتا جو بڑے شوق سے تیرے گھنگریلے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کیا کرتا۔ اور جب تجھے اپنے گھٹنوں پر بٹھلا کر تیرے ساتھ پہروں کھیلا کرتا۔ آج کچھ عرصے کے بعد بے جان ہو گا۔ تو اسے ہمیشہ

کیلئے کھو دے گی۔ ایک گونہ سے محروم کردی جائیگی۔ پھر تیرے لئے یہ سب کچھ کون کریگا؟
تیرے ہم عمر بچوں کے باپ ہوں گے۔ مگر تو یتیم ہوجائیگی۔ تجھے عید کے تحفے اور خوشنما
کھلونے کون لادیگا؟ سونے والی یتیم لڑکی! تو بغیر باپ کے کسطرح جی سکے گی۔

آہ! اگر تجھے جیوری کے ارکان ایک دفعہ دیکھ لیتے۔ تو میرے جگر کے ٹکڑے
وہ تیرے ساتھ کبھی اتنا ظلم نہ کرتے۔ وہ سمجھ لیتے۔ کہ تین سالہ معصوم بچی کے باپ
کو مارنا واقعی ظلم ہے۔

جب میری بڑی ہوجائے گی۔ تو اس کا کیا حال ہوگا؟
اس کے باپ کا نام بچہ بچہ کی زبان پہ ہوگا۔ لوگ اسے قاتل اور مجرم کے نام
سے پکاریں گے جب وہ میری نسبت ایسے دل شکن الفاظ سنے گی۔ تو لازماً میری
سوسائیٹی اسے حقارت کی نظروں سے دیکھیگی۔ صرف میری خاطر۔ اس باپ کی
خاطر جو اسے جان سے زیادہ عزیز جانتا تھا۔ اسے اتنی ذلت برداشت کرنی
پڑیگی۔ آہ! میری پیاری میری! کیا یہ سچ ہے کہ تو میرے نام سے نفرت کریگی۔
میرا نام لیتے وقت شرم محسوس کریگی۔

اُف! کیا یہ سچ ہے۔ کہ مجھے آج شام مرنا ہے۔

کیا وہ بدنصیب شخص میں ہی ہوں؟ کیا یہ شور و غوغا جو اس وقت میرے
کانوں کو سنائی دے رہا ہے ان تماشائیوں کا ہے جو میرا سر قلم ہوتے ہوئے دیکھنا
چاہتے ہیں۔

کیا مجھے ——— جو اس وقت اچھا بھلا کرسی پر بیٹھا ہوں۔ آزادانہ
سانس لے رہا ہوں جس کے کپڑے سامنے لٹک رہے ہیں۔ آج شام کو مرجانا ہے؟

(۲۷)

مجھے معلوم نہیں۔ کہ یہ چبوترہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ اور کس طرح ایک

انسان کو اس پر موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ آہ! وہ منظر کتنا خوفناک ہوگا؟

اس کا خیال کرتے ہی میری رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے میں حیران ہوں۔ کہ میں نے اس کا نام زبان سے کس طرح نکالا جبکہ اس خونی چیز کا نام لیتے ہی جان بلب ہوا ہو جاتی ہو۔ اور اس کے الفاظ اور اس کی ظاہری شکل ہی انسان کو پاگل بنا دیتی ہو۔ میں اس کی بابت ایک سوال کرنے کی بھی جرأت نہیں رکھتا لیکن یہ سب سے زیادہ خوفناک ہے۔ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس تختہ پر میرے ساتھ کیا سلوک لیا جائیگا۔ سوائے اس کے مجھے اور کچھ علم نہیں۔ کہ میرے جیسے بد قسمت انسانوں کو پیٹ کے بل اس تختہ پر لٹا دیا جاتا ہے۔ اور ایک تیز دھار چھرا ان کے سر کو۔۔۔۔

آہ! اس سے پہلے کہ میرا سر تن سے جدا ہو میرے بال سفید ہو جائیں گے!

(۳۸)

مجھے اس ہولناک تختۂ دار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک روز میری گاڑی اس چوک سے گذر رہی تھی مگر یکلخت ٹھہر گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تو مجھے بہت سے آدمیوں کا گروہ نظر پڑا ان کے درمیان دو شخص ایک بڑا سا چبوترہ بنانے میں مصروف تھے۔ کیونکہ اسی روز ایک مجرم کا گلا کاٹا جانیوالا تھا۔ میں نے دوسری طرف دیکھنے کیلئے منہ پھیرا۔ ایک عورت کو اپنے بچے سے مصروف گفتگو پایا۔ دیکھو۔ یہ چھرا ٹھیک کام نہیں کرتا۔ اس لئے اب وہ اسے تیل دے رہے ہیں۔ تاکہ اس کے گرنے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو جائے۔

وہ اس وقت اس چھرے کو تیل دے رہے ہوں گے۔ کیونکہ اب گیارہ بج چکے ہیں۔ اور وقت قریب آ رہا ہے۔

آہ! بد نصیب شخص! تو اس چھرے کی ضرب سے اپنا سر نہیں بچا سکتا!!

(۲۹)

آہ امی جانی!!

شائد وہ مجھے معاف کر دیں۔ بادشاہ کو میرے خلاف کوئی بغض و عناد نہیں میرے وکیل کو تلاش کرو! تو خدا کے لئے جلدی تلاش کرو!!! اس کا مشورہ حق و صداقت پر مبنی تھا مجھے عمر قید کی سزا کو قبول کر لینا چاہئے۔ وہ پانچ سال کیلئے ہو یا بیس سال کے لئے اگر عمر بھر کیلئے بھیج دیا جاؤں تو کیا خوب ہو۔ میری زندگی۔ آہ میری زندگی مجھے واپس دیدو۔

"عمر قیدی" چل سکتا ہے۔ گفتگو کر سکتا ہے۔ آفتاب کی جان بخش شعاعوں کو دیکھ سکتا ہے۔

(۳۰)

پادری میرے کمرہ کی طرف آ رہا ہے۔ وہ بہت متین صورت اور نیک شخص ہے۔ ابھی کل صبح کا ذکر ہے۔ کہ میں نے اسے قیدیوں کو خیرات دیتے ہوئے دیکھا مگر کیا وجہ ہے۔ کہ اس کا وعظ میرے دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ کیا وجہ ہے۔ کہ اس کے الفاظ موثر نہیں ہوتے۔ اس کے وعظ کا ایک لفظ بھی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا جس طرح قیدخانہ کے باہر کی کھڑکیوں پر بارش کے قطرے گر گر کر خشک زمین میں ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاتے۔ اسی طرح اس کے الفاظ میرے کانوں کے پردے سے ٹکرا کر اس منحوس چار دیواری میں صدا بصحرا ثابت ہوتے میں حسب معمول اسی وارفتگی کی حالت میں تھا۔ میرے خیالات طیور آوارہ کی طرح فضا کی بلندیوں میں پرواز کر رہے تھے کہ وہ آیا۔ اور میرے بستر کے قریب بیٹھ کر یوں گویا ہوا۔

"میرے بیٹے" ان دو لفظوں نے میرے گم شدہ آوارہ خیالات کو یکجا کر دیا۔ میں اب اس کے ہر لفظ کو ہمہ تن گوش ہو کر سننے کیلئے تیار تھا۔

میرے بیٹے! کیا تم خدا پر ایمان رکھتے ہو؟" پادری نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مقدس باپ! کیوں نہیں"

"کیا تم کیتھولک، اپوسٹل اور رومن گرجاؤں پر ایمان لاتے ہو؟"

"یقیناً! میں ان مقدس جگہوں کا بہت احترام کرتا ہوں"

"کہیں جبراً تو ایسا نہیں کہہ رہے؟"

یہ کہتے ہی اس نے ایک لمبی تقریر کرنی شروع کر دی ——— وہ عرصہ تک بولتا رہا ——— اپنے اس بیان میں جو کچھ بھی کہا۔ وہ پند و نصائح سے پر تھا۔ اس وعظ کو ختم کر کے اس نے پہلی مرتبہ میری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ اور کہا "تو اب"

اس کی وعظ کو اولاً میں نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا: ثانیاً میں نے اپنے دل و دماغ کے تمام دروازے کھول دیئے۔ تاکہ ایک لفظ بھی سننے سے نہ رہ جائے۔ میں اٹھا اور ادب سے جواب دیا۔ مقدس باپ مجھے کچھ عرصہ کیلئے تنہائی میں رہنے دیجئے۔ میں اسکے لئے جناب سے معذرت چاہتا ہوں۔

"تو پھر میں کب واپس آؤں؟" اس نے دریافت کیا۔

"میں آپکو اس وقت مطلع کروں گا"

اس پر وہ خاموشی کے ساتھ سپید سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ غالباً وہ اس وقت اپنے دل میں یہی کہہ رہا ہوگا "بڑا کافر ہے"

گو میں اس ذلت آمیز حالات میں زندگی بسر کر رہا ہوں ——— لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوں۔ مگر میرا خدا گواہ ہے۔ کہ مجھے اُس کی بزرگ ہستی پر ایمان ہے، مگر آہ! اس بوڑھے آدمی نے میرے ساتھ کس پیرایہ میں وعظ و نصیحت کی؟

اس وعظ نصیحت میں جس میں نام تک کو اثر نہ تھا ـــــ جو میری آنکھوں سے ایک قطرہ اشک نہ لا سکی ـــــ جس کے کسی لفظ نے میرے دل میں جگہ نہ پکڑی۔ ساون بھادوں کی بارش تھی جو صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر چند منٹ پانی برسا کر اس کو ویسے ہی پیاسا چھوڑ گئی ـــــ رٹی ہوئی عبارت جسے وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ حالانکہ اس کے برعکس، اس کی وعظ مؤثر اور پُر مغز ہونی چاہئیے تھی، جو سخت سے سخت آدمی خوفناک سے خوفناک قاتل کے دل میں فوراً جگہ کر لیتی۔ جو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا باندھ دیتی۔

مگر وہ ایک رٹا ہوا سبق تھا جو اس سے قبل ہزار مرتبہ سنایا جا چکا تھا۔ اس کی آنکھوں اس کی آواز، اس کے حرکات و سکنات سے وہ چیز ہویدا نہ تھی جس کا میں متوقع تھا۔ اس کا وعظ موثر ہو تو کیونکر۔ وہ جیل کا پادری ہے جسے ہر روز وہی سبق قیدیوں کو سنانا پڑتا ہے۔ وہ اس طرح بسر اوقات کر رہا ہے۔ قید خانہ زنداں کی تاریک اور مرطوب کوٹھڑیاں اس کی روزمرہ کی گزرگاہیں ہیں۔ عمر قیدی سزائے موت یافتہ اس کے لئے دو متضاد چیزیں نہیں۔ کاش وہ میری خاطر ایک ایسے پادری کو لائیں جس کے دل میں مجھ بدنصیب کا درد ہو۔ وہ اس کے پاس بغیر کسی اطلاع دیئے جائیں اور کہیں پادری صاحب چلئے آپ کی ایک گنہگار کیلئے ضرورت ہے جو اپنے گناہ بخشوانا چاہتا ہے۔ آپ کو اس وقت موجود ہونا ہوگا جس وقت وہ اس کے ہاتھ رسیوں سے باندھیں گے۔ اس خونی منظر میں بھی آپ کی موجودگی ضروری ہے جب اس کا گلا کاٹنے والے چبوترہ پر لٹکایا جائے گا۔ آپ کو اس کا سر قلم ہونے سے پیشتر اس کے ساتھ بغلگیر بھی ہونا ہوگا!"

یہ کہہ کر وہ اگر اسے میرے پاس لائیں۔ اس حالت میں کہ اس کا دل فرط غم سے دھڑک رہا ہو۔ سر سے پاؤں تک کانپ رہا ہو۔ تو میں اس کے مقدس زانوؤں

میں اپنے آپ کو گرا دوں۔ گھٹنوں پر کھڑا ہو جاؤں جیسے کہ اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دوں وہ میری حالت پر آنسو بہاتے ہوئے زار و قطار رو دیئے ہیں ابھی اشک بہاؤں ہم دونوں مل خوب جی بھر کر روئیں ——— اس طرح میرے تمام گناہ آنکھوں کے راستے بہ نکلیں گے۔ مجھے وہ اطمینان قلب جس کی مجھے عرصے سے آرزو ہے نصیب ہو جائے گا۔

میں نے غلطی کی ہے۔ اگر میں نے پادری کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ استعمال کیا اس حالت میں جب کہ وہ پاک اور نیک ہوا دمی ہیں ——— گنہگار سے ایک انسان کا قاتل جو کچھ بھی پادری کے متعلق کہہ چکا ہوں۔ اس کے ذمہ دار مجھے مت گردانیے۔ موت خصوصاً ایسی دہشت ناک موت انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

وہ ابھی میرا کھانا لائے ہیں۔ بہت ہلکی اور زود ہضم اشیاء ہیں۔ اس کا ذمہ دار مجھے مت گردانیے۔ موت خصوصاً ایسی وحشت ناک موت انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

وہ ابھی میرا کھانا لائے ہیں۔ بہت ہلکی اور زود ہضم اشیاء ہیں میں نے انہیں کھانا چاہا مگر پہلا لقمہ اٹھاتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں زہر کھا رہا ہوں۔ ——— میں نے کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔

(۳۱)

ایک آدمی ابھی ابھی میرے کمرہ کے اندر آیا۔ اور دیوار کے پتھروں کو ناپنا شروع کر دیا جب میں نے محافظ سے دریافت کیا کہ وہ شخص کون ہے تو معلوم ہوا کہ وہ جیل کا معمار ہے۔

وہ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اسے ہماری موجودگی کا بالکل علم نہیں اس کا غیر

معمولی انہماک میرے لئے ایک قسم کی دلچسپی پیدا کر رہا ہے۔

اپنے کام کے دوران میں اس نے ایک دفعہ اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے میری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ مگر فوراً ہی کچھ بڑبڑاتے ہوئے ناپنے میں مشغول ہو گیا۔

اپنے کام سے فراغت پا کر وہ میری طرف آیا۔ اور بلند آواز میں کہنے لگا "میرے اچھے دوست! چھ ماہ کے بعد اس قید خانہ کی حالت درست ہو جائیگی مگر افسوس ہے کہ آپ اس تبدیلی کو نہ دیکھ سکیں گے"

میرے بوڑھے محافظ نے اس کا جواب یوں دیا "جناب! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ پھانسی کی کوٹھری میں بلند آواز سے گفتگو کرنا منع ہے"

معمار چلا گیا اور میں

میں ان بے جان پتھروں میں سے ایک پتھر کی طرح جن کی وہ پیمائش کر رہا تھا پڑا رہا

(۳۲)

وہ آئے اور اس بوڑھے محافظ کی جگہ ایک اور آدمی متعین کر گئے میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا۔ کہ اسے الوداع کہنا بھول گیا۔

اس پیر مرد کے قائم مقام کے بشرے سے جہالت اور حماقت کے آثار نمایاں ہیں میں اس کے بارے میں صرف یہی رائے قائم کر سکا۔ کیونکہ اب پھر انہی ہولناک خیالات میں محو ہو گیا ہوں۔ اور سر کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کرسی پر بے جان مورت کی طرح بیٹھا آنے والے حادثے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔

اچانک کاندھے پر کسی ہاتھ کو محسوس کیا مڑ کر دیکھا تو اپنے محافظ کو کھڑا پایا "مجرم! کیا تمہارے پہلو میں حساس دل ہے" اس نے مجھے مجرم کے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔

"نہیں"

اسے اس نوعیت کے جواب نے جبکا وہ کسی حالت میں بھی متوقع نہ تھا چونکا دیا۔ اس لئے ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا" انسان اس قدر بے رحم نہیں ہوتا جتنا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔

"کیوں نہیں؟ اگر تمہیں اسی قسم کی گفتگو کرنی ہے تو میں کہوں گا۔ کہ مجھے تنہائی میں ہی رہنے دو"!

"آخر اس گفتگو کا مطلب"؟

مجرم! دولت اور خوشی۔ یہ دونوں چیزیں میری غلام ہو سکتی ہیں۔ مگر تمہارے ذریعے سے دیکھو میں ایک غریب محافظ ہوں۔ تنخواہ اتنی قلیل ہے۔ کہ میرا گذران مشکل سے ہوتا ہے۔ اسی خاطر میں نے کئی دفعہ لاٹری کی ٹکٹیں خرید کر اپنی قسمت آزمائی کی۔ مگر بے سود۔ اگر ۲۳ نمبر کا ٹکٹ خریدتا۔ تو ۲۳ نمبر کا انعام حاصل کر لیتا اس سے رہی سہی پونجی بھی تباہ ہو گئی۔ اب صرف ایک ذریعہ باقی ہے جس کا تمام تر انحصار تمہاری مہربانی پر موقوف ہے۔

تمہیں آج تختہ دار پر لٹکنا ہے۔ یہ ایک مسلم امر ہے۔ کہ جو شخص بھی اس طرح جان دیتا ہے اسے مرنے کے بعد لاٹری کے ان ٹکٹوں کے نمبر جنہیں انعام ملنا ہوتا ہے معلوم ہو جاتے ہیں مجھ سے وعدہ کرو کہ کل شب تمہاری روح مجھے ان ٹکٹوں کے نمبر بتا دیگی۔ معمولی سی بات ہے جب کہ میں بھوتوں سے خائف نہیں ہوں۔ میرا پتہ بھی بطور یادداشت لکھ لو۔ ویسے بھی تم مجھے پہچان سکو گے۔ کیا نہیں؟

اس خرافات کے جواب میں نے کچھ اور ہی دیا ہوتا۔ مگر اسی وقت میرے دل میں امید کی ایک موہوم سی کرن پیدا ہو گئی —— میری حالت میں ایسی امیدوں کا پیدا ہونا باعث تعجب نہ تھا۔

"سنو! میں تمہیں اس سے زیادہ امیر کبیر بنا سکتا ہوں۔ مگر صرف ایک شرط پر

میں نے اسے کہا۔

اس پر اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "کیا! کیا! وہ شرط کیا ہے؟" اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

"میرا کوٹ تم پہن لو۔ اور اپنا کوٹ مجھے دیدو۔"

"صرف اتنی سی بات؟" اس نے کوٹ کے بٹن اتارتے ہوئے کہا میں کرسی سے اٹھا۔ اور اس کی حرکات دھڑکتے ہوئے دل سے مطالعہ کرنے لگا میں نے ابھی سے یہ تصور باندھ لیا۔ "جب میں نے اس محافظ کی وردی پہنی ہوگی۔ تو جیل کے تمام دروازے میرے لئے کھلے ہوں گے۔ اور پھر میں اس منحوس جگہ سے کوسوں دور ہوں گا۔ لیکن وائے حسرتا! وہ اچانک میری طرف مڑا اور کہنے لگا۔

"لیکن کیا یہ کوٹ اس جگہ سے فرار ہونے کیلئے تو نہیں چاہتے؟" اس کا کہنا ہی تھا۔ کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ امید کا وہ موہوم خیالی نیست و نابود ہو گیا۔ مگر بے وقوفوں کی طرح آخری کوشش کی اور کہا۔ "مگر تمہیں دولت بھی تو مل جائے گی؟"

"نہیں! نہیں! میں ایسی دولت نہیں چاہتا تمہیں ضرور مرنا چاہیئے" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

میں ——— شکستِ امید بدنصیب پھر اپنی خیالات میں غرق ہو گیا

(۱۴)

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور حال کو مستقبل میں محو کرنا چاہا۔

عہدِ طفولیت اور جوانی کے گذرے ہوئے پیارے ایام کا تصور میرے مجروح دماغ میں ان شگفتہ اور تازہ پھولوں سے ملتا ہوا شجر بردل کی طرح ہے جو کسی

سیاہ سمندر سے گھرے ہوتے ہوں ——— کتاب طفولیت کی ورق گردانی کر رہا ہوں جب کم سنی میں ہرے بھرے کھیتوں میں قلابازیاں لگاتا ہنستا۔ دوڑتا تاریخ و فکر سے آزاد کھیل کود میں مصروف ہوتا۔

چار سال کے بعد بھی وہی بھولا اور معصوم بچہ تھا مگر فرق اتنا کہ کسی خوبصورت باغ میں میرے پاس ایک رفیق تنہائی بھی تھا ——— ایک نوعمر لڑکی بڑی بڑی آنکھوں اور شب دیجور ایسی سیاہ بالوں کی مالکہ چودہ کا سن غضب کا جوبن لب لعلیں اور سرخ رخسار جس کی نزاکت اور خوشبو تو گلاب کو شرمندہ کر رہی تھی۔

ہماری مائیں ہمیں سیر کرنے کیلئے بھیجتیں لیکن ہم سیر کی بجائے خلوت میں باتیں کرتے ——— باتیں ——— میٹھی میٹھی باتیں پیار اور کا جھگڑا ہر روز ایک نئے سبب پر ہوتا۔ وہ روٹھتی اور اپنی ماں کے پاس شکایت کرنے چلی جاتی مگر ایک سال بعد وہ میرے بازو کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ اور میں پُر فخر آدمی کی طرح اپنے دل میں جذبات اور محبت کا ہجوم لئے ہوتے اس کی شوخ نظروں کی طرف دیکھ رہا تھا ہم آہستہ آہستہ ٹہلتے۔ آہستہ بولتے میں اس کے لئے پھول اکھٹے کرتا اور جب ہم ملتے تو فرط محبت سے ہمارے ہاتھ کانپتے۔ وہ میرے ساتھ پر زرد نیلے آسمان اور قدرت کی دیگر رنگیوں کی بابت سیمیں آواز میں گفتگو کرتی! ہم دنیا سے بے خبر اپنی دھن میں محو ہوتے معصومانہ گفتگو کرتے مگر وہ اچانک شرماجاتی ——— کل کی بھولی بھالی بچی اب جوان ہو گئی تھی۔

بازو میں بازو ڈالے ہم شاہ بلوط کے بلند اور تناور درختوں کی اوٹ میں گلگشت کرتے تو وہ اچانک چپ سی ہو جاتی میرے بازوؤں سے اپنے بازو کو ہٹا لیتی اور کہنے لگتی "آؤ ہم دوڑیں"!

اس کی تصویر اب بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے اس کے دماغ میں بچوں

جیسا خیال آگیا تھا۔ اور کہا تھا۔ چلو ذرا دوڑیں!"
وہ میرے آگے دوڑنا شروع کرتی۔ ایسا کرتے وقت اسکی نازک کمر سانپ کی طرح بل کھا رہی ہوتی۔ کبھی کبھی باد نسیم کے جھونکے گستاخانہ انداز میں اس کے مرمریں جسم کو برہنہ کر دیتے۔
آخر کار میں اسے پکڑ لیتا اور بیدار بخت دلہن کی طرح اس کو بنچ پر بٹھا دیتا۔ سرتاپا تبسم ہنستی ہوئی میری طرف دیکھ کر کہنے لگتی "ابھی تو دن کی روشنی باقی ہے آؤ کچھ پڑھیں"
میں اس کے پہلو میں بیٹھ جاتا اور ہم کتاب کھول کر پڑھنے لگتے ورق کو الٹنے سے پیشتر اسے میرا انتظار کرنا پڑتا وہ مجھ سے کہیں زیادہ زود خواں تھی —
"صفحہ ختم کر لیا؟" وہ مجھ سے کہتی۔ حالانکہ میں نے ابھی پڑھنا ہی شروع کیا ہوتا تب ہمارے دل آپس میں مل جاتے ہمارے بال آپس میں آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتے ہمارا سانس ایک دوسرے سے مل جاتا۔ ہمارے ہونٹ آپس میں پیوستہ ہو جاتے اور جب ہم اس نشہ کے خمار سے ہوش میں آتے۔ تو آسمان جگمگاتے ہوئے تاروں سے مزین ہوتا۔
"اوہ! امی۔ اگر تمہیں معلوم ہو سکے کہ ہم نے آج کی سیر سے کس قدر لطف اٹھایا ہے!" وہ والینی بڑھیا ماں سے کہتی۔
"مگر تم ہمیشہ جیسے ہو" میری والدہ کہتی۔ اسے کیا معلوم تھا۔ کہ میرے دل میں اس وقت جنت آباد ہوتی تھی میرے جیسا اور کوئی شخص اس وقت روئے زمین پر نہ تھا۔
یہ ان پیاری شاموں سے ایک شام ہے جسکی یاد میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی —— جسے میں تمام عمر نہ بھولوں گا۔

(۳۴)

گھڑی کچھ بجا رہی ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کیا!

مجھے اس وقت سنائی نہیں دیتا کیونکہ کانوں میں عجب شور برپا ہے ۔ جیسے تمام گرجا گھروں کے گھڑیال ایک ساتھ بج رہے ہوں ۔ اسکی وجہ خیالات کی پریشانی اور موت کا خوف ہے ۔ اسوقت جبکہ میں اپنی زندگی کے گمشدہ اوراق کی ورق گردانی کر رہا ہوں ۔ ان دلچسپ اور لطیف ابواب کا مطالعہ کر رہا ہوں میرے دل میں یکایک اس خون کا خیال آیا جس سے میں نے اپنے ہاتھ رنگے تھے ۔ اُف! اسکا خیال کرتے ہی کانپ جاتا ہوں ۔ میں اپنے کئے پر نادم ہوں ۔ مگر اس ندامت سے مجھے ابھی تک پوری تشفی حاصل نہیں ہوئی ۔ اس سے دگنی عمر بھی اگر بحر ندامت میں ڈوبا رہوں توبہ کروں ۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاؤں تو بھی ناکافی ہے ۔

مگر موجودہ حالت میں گناہوں کے اعتراف کا کیا موقع! جبکہ میری زندگی اور موت کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فاصلہ باقی ہو ۔

اب بھی یہی خواہش ہے ۔ کہ جی بھر کے اشک ندامت بہاؤں اپنے گناہوں کی تلافی کیلئے ہر ممکن کوشش کروں ۔ مگر مگر ۔ اپنی زندگی کے خاتمہ کو نزدیک آتے دیکھکر گناہوں کی تلافی تو درکنار اوسان ہوا ہوئے جاتے ہیں ۔

اس لطیف ذلت اور ذلیل زندگی میں ایک خون کی ـــــــ میرے اور مقتول کے خون کی ندی حائل ہے ۔ ایک زمانہ کے بعد جن اشخاص کو ان سوانح کے پڑھنے کا اتفاق ہو گا ۔ وہ کبھی بھی باور نہ کریں گے ۔ کہ ان کا آغاز جرم سے شروع ہوا اور انجام کا گلا کاٹنے والے چبوترہ پر ۔ آہ! کچھ دیر کے بعد مرنے کا خیال خصوصاً اسوقت جبکہ وہی بدقسمت انسان اس سے ایک سال قبل معصوم اور آزاد ہو موسم بہار میں باغوں کی سیر کرتا ہو ۔ درختوں کے جھنڈ تلے اس حادثہ جانکاہ سے بے خبر

راگ الاپ رہا ہو۔ آف! یہ ناقابل برداشت خیال!!!

(۳۵)

یہ خیال کرتے ہوئے کہ لوگ گلی کوچوں میں چلتے ہوں گے خرم و خوش نظر آتے ہوں گے اخبارات کے مطالعہ میں مصروف ہوں گے کاندھے سے کاندھا ملائے تفریح میں مشغول نوجوان لڑکیاں ناچ کیلئے نیا لباس پہن رہی ہوں گی۔ اور مائیں اپنے بچوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہوں گی —— میں اس منحوس جگہ میں مقید ہوں!

(۳۶)

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ایک دفعہ میں رات کے وقت قدیم گرجا کا گھنٹہ گھر دیکھنے گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ تاریک سیڑھیوں کے ذریعہ گھڑیال تک جا پہنچا۔ تمام پیریں میرے قدموں میں تھا اچانک گھڑیال بجنا شروع ہوا۔ اس کے شور سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ دیواریں ہل رہی ہیں۔ میں خوفزدہ ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ میرے کان شور سے پھٹے جاتے تھے۔ یہی معلوم ہو رہا تھا کہ اب گرا اب گرا۔

آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی گھنٹہ گھر میں ہوں۔ میرے ہوش جواب دے رہے ہیں۔ میں اس جگہ سے محروم کر دیا گیا ہوں جہاں دیگر انسان آزادی سے پھر رہے ہیں۔

(۳۷)

سامنے والی عمارت ایک ہوٹل ہے جس کی ڈھلوان چھت۔ لاتعداد کھڑکیاں مسلسل دیواریں بھدی سیڑھیاں شکستہ محرابیں عجب گھناؤنا اور خوفناک منظر پیش کر رہی ہیں۔ اسقدر سیاہ عمارت کہ دن کی روشنی میں بھی اس کی سیاہی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سزائے موت یافتہ مجرم اپنی زندگی کے چند لمحات گزارتا ہے جہاں محافظ اور دیگر اہلکار تعینات رہتے ہیں۔

اس خونی دن جب مجرم کی گاڑی پہنچتی ہے۔ یہ منحوس عمارت ان محافظوں

کی آنکھوں سے اس منظر کا تماشا دیکھتی ہے۔

اس کے باہر رات کو روشنی کرنے کا کوئی انتظام نہیں ——— اگر کوئی روشنی ہے۔ تو اس چراغ کی جو گھڑی کے ڈائل کے پیچھے جلتا ہے۔ تاکہ لوگ وقت دیکھ سکیں۔

(۳۸)

سوا ایک کا وقت ہے۔

میں اس وقت مندرجہ ذیل ذہنی اور جسمانی تکالیف سہہ رہا ہوں میرے سر میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ میرے جسم کا رواں رواں درد کر رہا ہے میری پیشانی آگ کی طرح تپ رہی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دماغ پھٹ رہا ہو کنپٹیوں پر خون کی گردش اس قدر تیز ہے۔ کہ کانوں میں عجیب عجیب آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ لکھتے وقت قلم ہاتھ سے گر گر پڑتا ہے آنکھوں میں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں باز و جواب دے رہے ہیں۔ صرف دو گھنٹے اور باقی ہیں۔ اس کے بعد ان تمام تکالیف کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۳۹)

ان کا خیال ہے کہ اس نوعیت کی سزا کوئی تکلیف دہ نہیں۔ یعنی گلو بریدی مجرم کیلئے زیادہ اذیت رساں نہیں ہوتی۔

آہ اگر وہ خدارا یہ تو بتلائیں۔ کہ وہ ان چھ ہفتوں کے دکھ کو جن میں عمر بھر کے رنج و آلام یکجا کر دئیے ہوئے ہیں ——— اس یوم کی روح فرسا یاد کو جس کا خیال کرتے ہی بال سفید ہو جاتے ہیں۔ کیا نام دیتے ہیں۔؟ ———

غم و اندوہ کی سیڑھی کو جس کا خاتمہ اچانک موت کے چبوترہ پر ہوتا ہے۔ کیا پکارتے ہیں! جسم کو خون کے آخری قطرہ سے محروم کر دیا۔ اور ذہن کو آہستہ آہستہ خیالات سے

عاری کر دینا دو متضاد چیزیں نہیں۔ جسمانی قوت ——— اور ——— ذہنی موت مگر پھر بھی موت ۔ اتنی ۔ تکلیف دہ نہیں ۔ مگر مقصد وہ یہ تو بتلائیں ۔ کہ آخر انہیں یہ کیونکر معلوم ہُوا

کیا یہ انہیں مجرم کے کٹے ہوئے سر سے معلوم ہُوا ۔ یا موت کے بعد مجرم ان کا شکریہ ادا کرنے آئے ۔ اور کہا ۔ جناب یہ سزا بالکل تکلیف دہ نہیں ۔ خوب اختراع ہے ۔ آپ اس پر بھروسہ رکھیں بس ایک ہی لمحہ میں کام تمام ہو جاتا ہے ۔ اس سے کیا یہ ایجاد دولتیپیری کی ہے ۔ یا لوئی یازدہم کی؟

کچھ بھی ہو ہے خوب! بس ایک منٹ میں ہی اپنا خونین کام کر جاتی ہے ۔ انہیں سے آج تک کسی نے بھی اس شخص کی تکالیف کا بغور مشاہدہ نہیں کیا ۔ جو اس چبوترہ پر پھرسے کی بھاری ضرب کا منتظر ہوتا ہے ———

اس تیز چھری کی ضرب کا جو ایک لمحہ میں اس کی گردن کی نسیں چیرتی ہوئی حلقوم تک پہنچے گی اور گردن کو تن سے جدا کر دے گی ۔

سچ ہے تکلیف واقعی نہیں ہوتی ۔!

درد موت کے ہولناک خیال سے مغلوب ہو کر اپنا اثر زائل کر دیتا ہے ۔

(۴۰)

میرا ذہن بار بار بادشاہت کی طرف منتقل ہوتا ہے ۔ میں اپنے ہر فعل میں بادشاہ کے وجود کو متصور پاتا ہوں ۔ میرے قلب کی عمیق ترین گہرائیوں سے یہ صدا اُٹھ رہی ہے

اسی قریہ میں اسی جماعت اسی جگہ کے قریب محل میں ایک اور ہستی ہے ۔ جس کے دروازوں پر محافظ پہرہ دیتے ہیں ۔ اس میں اور تم میں اتنا فرق ہے ۔ کہ وہ جس قدر بلند ہے ۔ تم اسی قدر پست ہو ۔

اس کی محفل حیات سے مزین ہے ۔ شوکت سے سطوت اور احترام سے اس کے

سامنے بڑے بڑے شوریدہ سر اپنے سروں کو جھکا دیتے ہیں۔ اس کا ماحول زرّیں اور نیمیں ہے۔ اس وقت وہ اپنے وزراء کے کسی مشورات میں مشغول ہوگا۔ جہاں اس کی رائے سب کی رائے ہوگی یا جہان بھر کے پیام عیش و سرور کا منتظر ہوگا۔ وہ دوسروں کی تکالیف سے اپنی راحت حاصل کر سکتا ہے۔

اس انسان کی تخلیق بھی اسی آب و گل سے ہے جس سے تو بنایا گیا ہے۔ وہ موت کے احکام کو اپنے نام کے سات حروف سے مبدل بہ حیات کر سکتا ہے۔ وہ اچھا ہے۔ اور میں بُرا:

(۴۱)

آئیے موت کا خیال کیجئے۔ یہ کیا ہے! کس کی تلاش میں ہے؟ اس مسئلہ کے اعماق کا اندازہ لگائیے مرقد کی طرف دیکھئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرنے کے بعد میری روح منوّر فضاؤں میں پرواز کریگی۔ آسمان بجائے نیلگوں ہونے کے سنہری ہوگا۔ اور ستارے اس سنہری پردہ پر سیاہ داغ ہونے کے بعد ایک میدان کا رخ کرے جہاں اسی قسم کے دوسرے سر موجود ہوں۔ جب کبھی میری آنکھیں کھلیں گی۔ تو سوائے سیاہ آسمان کے انہیں کچھ نظر نہ آئے گا۔ انہیں رات کے وقت سرخ ذرات بھی نظر آئیں گے مگر مجھ تک پہنچتے ہی وہ آتشی طیور بن جائیں گے۔ یہ تواتر و تسلسل غیر مختتم ہوگا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوگا۔ کہ سزائے موت کے تمام مجرم مجتمع ہو کر ایک جماعت کی صورت اختیار کریں گے وہاں تختۂ دار بھی ہوگا۔ اور جلاد بھی شیطان اسی تختۂ دار پر اسی جلاد کو لٹکائے گا۔ جس کے ہاتھوں ہم مرے ہوں گے ——— اور ہم سب اس کے گرد و نگرد اس منظر کا تماشا کرتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ چار بجے صبح ہوگا۔

اگر مُردوں کو دوبارہ زندگی بخشی جائے۔ تو وہ کس صورت میں ہونگی جسم کے علیحدہ علیحدہ حصوں کو کون یکجا کریگا!

آہ! موت ہماری روحوں کے ساتھ کیا کرتی ہے!

کیا موت نے کبھی اپنے زمین کے شکاروں پر آنسو بہائے ہیں؟ آہ!

پادری۔ ایک پادری جو یہ سب کچھ جانتا ہے پادری اور صلیب میرے خدا!!

(۴۳)

میں نے سونا چاہا اس لئے بستر پر لیٹ گیا خون کے دو ان کی تیزی روانگی اور پریشان خیالات نے مجھے تھپکی دیتے ہوئے سلا دیا نہیں بے ہوش کر دیا۔ یہ بیہوشی میری آخری نیند ہے۔ اسی بے خودی میں ایک خواب دیکھا کہ رات ہے۔ اور میں دو تین دوستوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا ہوں باتیں جو ہولناک اور خوفناک تھیں۔

اچانک میں نے دوسرے کمرے میں کچھ آواز سنی آواز جو کسی دروازے کی چٹخنی کھولنے سے پیدا ہوتی ہو۔ اس خوفناک آہٹ نے ہم سب کے اوسان خطا کر دیئے ہمارے خون کو رگوں میں منجمد کر دیا ہم نے یہی خیال کیا کہ چور گھر میں گھس آئے ہیں۔ اس لئے ہم اس کی جستجو کے لئے اٹھے میں شمع ہاتھ میں لئے سب کی رہنمائی کر رہا تھا۔

ہم کو خوابگاہ سے گذرے جہاں میری بیوی اپنی بچی کو پہلو میں لٹائے سو رہی تھی۔ اس سے گذرتے ہوئے ہم بڑے کمرے میں پہنچے۔ مگر وہاں بھی اس اسرار کا سراغ ہاتھ نہ لگا خیال آیا کہ شاید کمرہ طعام میں ہی سے گوہر مقصود حاصل ہو جائے لہذا اس طرف قدم بڑھائے۔

کانپتے ہاتھوں میں نے دروازہ کو آہستہ آہستہ کھولا حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ایک معمر عورت کو وفق الفطرت حالت میں دیوار کے ساتھ کھڑا پایا جیسے بالکل تصویر کی طرح بے حس و حرکت دیوار سے چمٹی ہوئی۔

اس کی موجودہ ہیئت کذائی اس قدر وحشت خیز تھی کہ اس کا خیال کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"کیا کر رہی ہو تم" میں نے بالآخر جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہی۔

"تم کون ہو؟" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

مگر وہ پھر نہ بولی اور آنکھیں بند کئے ویسے ہی جمی رہی میں نے اس سے دوبارہ سہ بارہ سوال کیا۔ مگر بے سود۔

ایک نے تنگ آکر اسے دھکا دے دیا۔ اسے دھکیلنا ہی تھا کہ وہ بے جان گٹھڑی کی طرح زمین پر آ رہی۔

اس حادثہ نے ہمارے رہے سہے حواس گم کر دیئے۔ "وہ کیا مردہ تھی؟"

"اس کی ٹھوڑی کو ذرا شمع کی لو تو دکھاؤ؟"

مجھے ایک دوست نے رائے دی میں نے اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اس معمر عورت کی ٹھوڑی کے نیچے شمع رکھ دی اس پر اس نے ایک آنکھ کھولی آنکھ وہ خوفناک آنکھ جو بینائی سے محروم تھی۔

"تم کون ہو؟ شیطان کی خالہ" میں نے اس سے دریافت کیا۔ مگر یہ کہنا ہی تھا کہ اس نے آنکھ بند کر لی۔

"پھر اس عمل کو دہراؤ" میرے دوستوں نے کہا۔ جو اس معمہ کو حل کرنے کیلئے بہت بے چین تھے۔

میں نے پھر شمع اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دی اس دفعہ اس نے دونوں آنکھیں کھول دیں۔ مگر بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی اور شمع کو گل کر دیا۔

قیامت کی تاریکی چھا گئی ـــــــ اسی وقت میرے بالوں کی کی

تین دانت بیوست ہو گئے ــــ فرطِ خوف سے میں بیدار ہو گیا۔
پادری میرے سرہانے بیٹھا دعا پڑھ رہا تھا۔
"میں زیادہ سویا ہوں کیا؟"
"میرے بیٹے! تم نے صرف ایک گھنٹہ نیند کی ہے، ماما تمہاری لڑکی کو ملحقہ کمرے میں لئے تمہارا انتظار کر رہی ہے!"
"آہ! میری لڑکی! میرے جگر کا ٹکڑا کیا! خدا کے لئے اسے جلد میرے پاس لاؤ۔"

(۴۲)

نازک کلی ــــ معصومیت کی تصویر ــــ میرا لختِ جگر ــــ میری بھولی بچی میری اپنی ماما کے ساتھ میرے کمرے میں آئی۔
تتلی ایسے خوبصورت لباس میں کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کر اس کے بالوں کو چومنا شروع کر دیا۔ کبھی اسے چھاتی سے لگا نازک رخساروں کا بوسہ لیتا، بھینچ لیتا۔ میری ان حرکات سے حیران اپنی ماما کی طرف دیکھ رہی ہے۔ جو کونے میں اس منظر سے متاثر کھڑی آنسو بہا رہی ہے۔
"میری! میری پیاری میری!" یہ کہہ کر میں نے اسے رنج والم سے پر چھاتی سے زور کے ساتھ بھینچ لیا۔
"آہ! جناب! آپ مجھے تکلیف دے رہے ہیں" ــ میری نے ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے کہا۔
جناب! آہ! البتہ آسمان! اسے مجھ سے جدا ہوئے قریباً ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بھول گئی ــ اسکے ذہن سے باپ کی شکل و شباہت اور آواز محو ہو گئی۔ اس کے علاوہ مجھے اس ہیئت کذائی میں پہچاننا بھی تو دشوار تھا۔ لمبی سی ڈاڑھی یہ ذلیل لباس ــ اُف! کیا میری تصویر اس کے ذہن سے اتر گئی ہے جس میں میں اسے

منتقل کرنا چاہتا تھا۔

کیا میں اپنی بیٹی سے اسی پیار دے اور شیریں لہجہ میں باپ کہتے ہوئے سنونگا اُف دماغ پھٹا جاتا ہے۔ دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ جناب! اُف! یا میرے خدایا، آہ! میں اپنی چالیس سالہ زندگی کے بدلے صرف ایک چیز کا خواہشمند ہوں اپنی موت کے عوض ایسا لفظ چاہتا ہوں۔ اپنی پیاری بیٹی کے منہ سے صرف باپ کا لفظ!

"دیکھو میری بچی! کیا تم مجھے جانتی ہو" میں نے اس کے ننھے اور سبک ہاتھ اپنے ہاتھ میں جوڑتے ہوئے کہا۔

میری طرف جھکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "جی نہیں"

"میری بچی غور سے دیکھو تو میں کون ہوں؟"

"شریف آدمی" اس نے بھولے پن سے جواب دیا۔

آہ! جس ذات سے میری تمام خواہشیں اور مسرتیں وابستہ ہیں۔ جو میری محبت کا مرکز ہے۔ میرے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہے مگر نہیں پہچانتی اپنے تیرہ بخت باپ کی صورت سے ناآشنا ہے۔

میں اس سے تسکین قلب کا خواہاں ہوں۔ مگر وہ اس سے بے خبر ہے نہیں جانتی کہ اس کے والد کو جس کی موت میں صرف چند گھنٹے باقی ہیں۔ اس کے منہ سے صرف ایک کلمہ سننے کی خواہش ہے۔

"میری بچی! کیا تمہارا باپ ہے؟"

"جی ہاں"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟"

وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہی۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مرگیا ہے" یہ کہنا ہی تھا۔ کہ وہ رونے لگ پڑی۔

"مرگیا ہے؟ ہمیری کیا تمہیں معلوم ہے۔ کہ مرنا کسے کہتے ہیں؟"

"جی ہاں! وہ آسمان پر ہیں میں ان کے لئے امی کے ساتھ ہر روز دعا مانگا کرتی ہوں"

اس نے جواب دیا۔

"ہمیرا وہ دعا تو سناؤ؟"

"نہیں جناب دعا تو رات کے وقت مانگی جاتی ہے۔ نہ کہ دوپہر کے وقت اگر سننی ہے تو کسی دن رات کو میرے گھر آیئے۔"

بس! اُف یہ لفظ میرے مجروح دل کی نمک پاشی کیلئے کافی ہیں میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔

"ہمیری! تمہارا باپ ہوں" میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" ہمیرا نے حیرت سے کہا۔

"کیا میں تمہیں پسند نہیں؟"

"نہیں جناب! میرا باپ تو بہت خوبصورت تھا"

میں نے اس کے چہرے کو اپنے آنسوؤں اور لگاتار بوسوں سے تر کردیا وہ گھبرائی اور چیختے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ تو میرے رخسار اپنی ڈاڑھی سے چھیل رہے ہیں"

میں نے اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھلالیا۔ اور کہا ہمیری کیا تم پڑھ سکتی ہو؟"

"میں پڑھ سکتی ہوں۔ امی مجھے ہر روز پڑھایا کرتی ہیں"

"اچھا تو یہ پڑھو" میں نے اس کے ہاتھ سے ایک چھپا ہوا کاغذ لیتے ہوئے کہا۔ جس سے وہ غالباً کھیل رہی تھی۔ اس نے کاغذ کو کھولا۔ اور ننھی سی انگلی رکھتے ہوئے

لفظوں کے ہجے کرنے لگی۔ ف ا ت۔ فت، و ی۔ وی، ہم، وہ مو ت۔ موت۔ فتویٰ موت میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔ وہ میری سزائے موت کا فتویٰ پڑھ رہی تھی جو بازار میں ایک پیسہ کو بک رہا تھا۔ اس نے اسے غالباً اپنی ماما سے لیا ہوگا۔

اس وقت میرے دل کی جو حالت ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

"مجھے میرا کاغذ دے دو" میری چلا کر کہنے لگی۔

"خدا کیلئے لے جاؤ اسے" یہ کہہ کر میں کرسی پر گر پڑا۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں جبکہ میرے رابطۂ دل کا آخری تار بھی ٹوٹ گیا ہے۔ میں موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(۴۴)

پادری اور محافظ دونوں بہت رحمدل ہیں۔ مجھے یقین ہے مگر جس وقت میں نے اپنی لڑکی کو واپس بھیجا۔ تو پادری کی آنکھیں نمناک تھیں۔

خیر! یہ تو سب کچھ ہوا۔ مگر مجھے اب تختہ دار اور جلاد کے لئے گردن اور تماشائیوں کیلئے دل کو مضبوط کر لینا چاہئے۔

میرے پاس چیزوں پر غور کرنے کیلئے ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے؛

(۴۵)

اس خونیں منظر کو دیکھنے کیلئے بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہوں گے گلے کاٹنے کا یہ تو ان کے لئے موجب فرحت و انبساط ہوگا۔ مگر وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ کہ ان تماشا کرنے والوں میں سے جو اس وقت آزادانہ طور پر چل پھر رہے ہیں، کئی ایسے بدقسمت شخص ہوں گے جو میری طرح اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید کر دیئے جائیں گے جن کا سر میری طرح اس خونیں چبوترہ پر قلم کیا جائیگا۔ بیہوش بخانقل!

(۴۶)

ننھی میری اب گاڑی میں گرجا جا رہی ہو گی۔ وہ کھڑکی سے اس گروہ کا تماشہ دیکھے گی۔ تو اس "شریف آدمی" —— آہ! مجھ بدبخت باپ کو بالکل بھول جائیگی اگر مجھے وقت ملا تو میں اس کیلئے ضرور کچھ نہ کچھ قلمبند کر دونگا شاید وہ تحریر آج نہیں دس سال بعد اس کو خون کے آنسو رلائے۔

جب وہ میرے سوانح حیات[1] پڑھے گی۔ تو خود بخود سمجھ لے گی۔ کہ اس کے حقارت سے دیکھے جانے کا سبب کیا ہے بھولی لڑکی! کاش وہ اپنے والد کی گود میں کچھ دیر اور کھیلتی!!

(۴۸)

ہوٹل دی ویل کا ایک کمرہ۔

ہوٹل دی ویل! میں یہاں ہوں۔ پر از مصائب سفر ختم ہو چکا ہے۔ قتل گاہ میرے سامنے ہے کھڑکی کے نیچے تماشائیوں کا انبوہ کھڑا ہے جو میری صورت دیکھنے کو بے حد منتظر ہے۔

جب میں نے تختہ دار کو دیکھا۔ تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے آخری گفتگو کرنی چاہی۔ انہوں نے اس مطلب کیلئے ایک وکیل کو بلا بھیجا ہے۔ اسکا منتظر ہوں تین بجے انہوں نے مجھے اطلاع دی۔ کہ وقت قریب ہے۔ میں کانپ اٹھا۔ مجھ پر غیر متوقع تاثرات نے قبضہ جما رکھا ہے۔

وہ مجھے ایک کمرہ میں لے گئے جو کہ بہت تنگ تھا۔ سورج کی روشنی نہ بہاں تک

---

[1] ملحقہ اوراق باوجود تلاش بسیار دستیاب نہ ہو سکے۔ شاید اسیر اپنے سوانح حیات نہ لکھ سکا، جیسا کہ آئندہ باب سے واضح ہوتا ہے۔ اسے اس امر کا دیر بعد خیال آیا ہوگا (ناشر)

بمشکل پہنچ سکتی تھی۔

کچھ لوگ دروازے کے قریب کھڑے ہیں۔ دو حجام آہستہ سے میری طرف آئے اور میرے سر کے بالوں کو جو میرے شانوں پر پڑے ہوئے تھے کاٹنا شروع کیا۔ اسوقت کمرے میں ہر شخص آہستہ گفتگو کرتا۔ مگر کمرے کے باہر عوام ہنس رہے تھے —— ان کے شیطانی قہقہوں کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

کھڑکی کے قریب ایک نوجوان پنسل سے کچھ لکھ رہا تھا۔ لکھتے وقت میں نے ملازم سے اس رسم کے متعلق دریافت کیا۔ میرے بال کاٹنے کے عمل کا نام پوچھا۔

"مجرم کا سنگار" حجاموں نے جواب دیا۔

اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ وہ شخص نامہ نگار ہے۔ اور جو کچھ بھی یہاں ہو رہا ہے وہ کل کے اخبارات میں شائع ہو جائیگا۔

ازاں بعد ایک ملازم نے میرے کپڑے اتارنے شروع کئے۔ جب وہ قینچی سے میرا کالر کاٹ رہا تھا۔ تو گردن پر سرد لوہے کو محسوس کرتے ہی میرے جسم میں کپکپی طاری ہوئی

"کیا آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی معاف کر دیجئے گا" جلاد نے کہا۔

آہ! یہ جلاد بھی اپنی قسم کے رحمدل ہوتے ہیں۔

تب دوسرے آدمی نے میری کلائیوں کے گرد ایک ہلکا سا دھاگا لپیٹ دیا اب ہر چیز پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ پادری صلیب کے نزدیک آیا۔ اور بولا۔

"آؤ میرے بیٹے آؤ!"

کمرہ میں موجود لوگوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ میں بمشکل دو چار قدم چل سکا میرے پاؤں بہت وزنی ہو چکے تھے۔

خیر بعض تنگ و تاریک کمروں سے گذر کر ہم ایک دروازہ تک آئے جس کے دائیں جانب محافظ سواروں کا ایک دستہ تھا۔ بائیں طرف ایک گاڑی تھی۔ زنداں کی

کوٹھری کی دوسری بہن۔

"وہ ہے .... وہ آخر کار رہ گیا" انبوہ سے آواز آئی بعض لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ گویا ان کے نزدیک اس سے مسرت بخش سماں کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

طویل القامت جلاد سب سے پہلے گاڑی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اسکا ایک نوکر داخل ہوا۔

اب میری باری تھی۔ میں دل کو قوی کرتے ہوئے گاڑی پر سوار ہوا۔

"اس کے ہوش وحواس قائم ہیں" ایک خاتون گروہ سے بولی۔

میں نے اپنے گرد وپیش نظر دوڑائی۔ تہ محافظ ——— پیچھے محافظ۔

انبوہ ——— انبوہ ——— بازار میں انسانی سروں کا سمندر گاڑی کے چلتے ہی تمام "جلوس" نے بھی حرکت شروع کی۔

"ٹوپیاں اتارو" ہزار ہا لوگوں نے کہا۔

گویا وہ کسی بادشاہ کا استقبال کر رہے تھے۔ میں مسکرایا اور پادری سے یوں کہا

"وہ اپنی ٹوپیاں اتاریں .... اور میں اپنا سر .... "

سامنے کھڑکیوں میں ہزار ہا تماشائی بیٹھے ہوئے ہیں ——— عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔

بعض ظالموں نے میزوں اور کرسیوں سے جگہ آراستہ کر رکھی تھی۔ اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔

"کسی کو جگہ چاہیے؟"

جی میں آئی کہ کھڑا ہو کر ان سے دریافت کروں۔ "میری جگہ کسے چاہیے" مگر چپ رہا۔

گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ قدم قدم پر گاڑی کو رکنا پڑتا۔ کیونکہ ہجوم میری

گاڑی کے آگے آگے کھڑا ہو جاتا ۔۔۔ وہ مجھے بار بار دیکھنا چاہتے تھے ۔ میرے خیالات بہت پراگندہ ہو گئے تھے ۔ اس لیئے میں نے چاہا ۔ کہ ہر طرف سے لاپرواہ ہو کر صرف پادری کی طرف متوجہ ہوں میں نے صلیب کو اٹھایا ۔ اور اسے بوسہ دیا ۔

" میرے خدا مجھ پر رحم کر " میں نے گاڑی کی سیاہ چھت کی طرف تکتے ہوئے کہا مینہ برس رہا ہے ۔ جس نے میرے کپڑوں کو تر کر رکھا ہے غضب کی سردی ہے اکڑا جا رہا ہوں ۔

" میرے بیٹے ! کیا تم سردی سے کانپ رہے ہو " ! پادری نے دریافت کیا ۔

" مقدس باپ صرف سردی سے ہی نہیں "

پل کے اس پار چند عورتیں میری حالت اور جوانی سے متاثر میری موت پر اظہار افسوس کر رہی تھیں ۔

آخر کار منزل مقصود پہنچی چاروں طرف لوگوں کا ہجوم ہے ۔ ان میں سے ہر ایک میرا واقف ہے ۔ میرا نام بچہ بچہ کے زبان زد ہے ۔ اس قدر لوگوں کی نگاہوں کے بار سے دبا جا رہا ہوں ۔ اس منظر کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا ۔ بیہوش سا ہو گیا ۔ اب اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر ہوں ، معلوم نہیں لوگ اظہار انبساط کر رہے ہیں یا اظہار نفرت !

میرے بائیں جانب " نوترے ڈیم " کا گرجا ہے ۔

گاڑی آگے بڑھی اور تماشائیوں کے گروہ سے گذر گئی ۔ میں خاموش پڑا رہا ۔ اچانک گاڑی رک گئی ۔

" میرے بچے ہمت کرو ! " پادری نے کہا ۔

گاڑی کے ساتھ ایک سیڑھی لگا دی گئی ۔ روشنی میں کچھ نظر پڑا ۔ آہ ! وہ حقیقت ہے ۔

" مجھے آخری خواہش کا اظہار کرنا ہے " میں نے ان سے التجا کی ۔ انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیئے ۔ مگر رسی موجود ہے ۔ آخری خواہش لکھ چکنے کے بعد پھر وہی رسی ہوگی

اور میری کلائیاں اور سائے۔

(۴۹)

منصف! کمشنر! مجسٹریٹ! خدا معلوم کون ——— آیا،
میں نے اس سے اپنے معافی نامہ کیلئے استدعا کی۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے سفارش کے لئے کہا۔ زانو پر کھڑا ہو کر گڑگڑا کر التجا کی۔ مگر اس پتھر جیسے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جواب دیا تو یہ "کیا یہی کچھ کہنا ہے تمہیں!
معافی! معافی نامہ حاصل کرنے کیلئے صرف پانچ منٹ کا قلیل عرصہ:—
میری خاطر نہیں تو خدارا رحم کی خاطر کسے خبر ہے کہ عرصہ میں میری رحم کی درخواست منظور ہو جائے۔ آہ! اس عمر میں خصوصاً ایسی موت مرنا کسقدر ہولناک ہے۔ جناب! اگر وہ مجھ بد قسمت پر رحم نہیں کریں گے۔ تو کس پر کریں گے۔ کیا میں اس کا مستحق نہیں؟ میں ملتجی ہوا۔ مگر بیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دے۔ جلاد کمرے میں داخل ہوا اور مجسٹریٹ سے کہنے لگا۔ "چونکہ مقررہ وقت قریب آ رہا ہے۔ اس لئے آپ کی موجودگی وہاں ضروری ہے۔ خدا کے لئے تھوڑی دیر انتظار کرو تمہیں رحم کا واسطہ ایک لمحہ تو ٹھہرو۔ شاید معافی نامہ آ جائے۔ اگر ایسا نہ کرو گے۔ تو بخدا میں تمہیں کاٹوں گا اپنی جان بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔
مجسٹریٹ اور جلاد کچھ کہے بغیر چلے گئے۔ اب میں اکیلا ہوں۔ اکیلا دو محافظوں کے درمیان۔ اُف! میں پاگل ہو رہا ہوں۔ مگر اب بھی میرے دل میں اُمید کی آخری کرن باقی ہے ——— معافی ——— شاید میں اس ہولناک موت سے بچ جاؤں ——— ناممکن وہ میری درخواست رحم کو رد کر دیں گے ——— ظالم! سفاک!! ——— کوئی میرے کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ میرے اللہ! جلاد!! ——— بس ——— خاتمہ ———

——— (چار کا وقت) ———

انتقامِ اسیر

انتقامِ اسیر

آج سے آٹھ سال قبل پیرس کے خوبصورت شہر میں ایک غریب مزدور رہتا تھا۔ اپنے علاوہ اسے دو پیٹ اور پالنے پڑتے ——— اس کی مالکہ یعنی بیوی ——— اور ننھا سا بچہ ———

میں ناظرین کی خدمت میں حقیقت بیان کر رہا ہوں جس میں کسی قسم کے تصنع کو دخل نہیں۔ جو کچھ بھی ہے۔ صداقت پر مبنی ہے۔ اس سے سبق حاصل کرنا اس کے پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

بچپن ہی سے وہ پردۂ غفلت میں رہا۔ آغوشِ جہالت میں پرورش پاتا رہا مگر با ایں ہمہ وہ ایک اچھے دماغ کا مالک تھا۔ دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے حادثے پر گھنٹوں فکر کرتا۔

موسم سرما آیا۔ حسبِ معمول تکالیف و مصائب کے ساز و سامان سے آراستہ ایندھن کی کمی ——— مٹی کی کمی ——— مزدوری کی کمی!!! وہ شخص، اس کی بیوی اور بچہ فاقوں پر فاقے کرتے۔ مگر انجام کار اس ذلیل زندگی سے تنگ آ گئے۔

مزدور چور بن گیا۔

مجھے معلوم نہیں اس نے کیا چرایا۔ مگر اتنا معلوم ہے۔ کہ لڑکے اندر اسکا

کی مال کے لئے تین دن کا خورد و نوش مہیا ہو گیا۔ اور اُس کیلئے پانچ سال کی سزا۔

اس کو سزا کے ایام پورے کرنے کیلئے زندان میں بھیج دیا گیا۔ زندان جو گرجا گھر کی عمارت میں تبدیل کر دیا گیا تھا —— اب اس معبد کے کمرے۔ تنگ و تار کوٹھڑیاں اس کی قربان گاہ۔ وہ چوبی کٹہرا جس میں پھانسی دی جاتی ہے۔

بعض اصحاب کے نزدیک یہ ترقی ہے۔ تمدنی ترقی۔

خیر! زندان میں رات تو وُہ کوٹھڑی میں بسر کرتا۔ اور دن بھر کارخانہ میں۔ مجھے کارخانہ سے کوئی نفرت نہیں۔

کلاَدے گیو (یہ مجرم کا نام تھا)، ایسا ایماندار ضرور۔ اگر چوری کرنے پر مجبور ہُوا تو اپنی مشکلات کی بنا پر۔ ورنہ وہ سلیم الدماغ نیک اور رحمدل تھا۔ وہ نہایت ہی اچھے دماغ کا مالک تھا۔

اب آپ دیکھیں گے۔ کہ سوسائٹی نے اس دماغ کے ساتھ کیا سلوک کیا اپنے کام کے دوران میں شاید ہی وُہ کسی سے ہمکلام ہوتا۔ مگر اس کے چہرے سے وقار اور وفاداری عیاں تھی۔

جیل کے اندر کلاَدے گیو کو کارخانہ میں کام کرنا پڑتا۔ اس کی نگرانی کیلئے ایک نائب ناظم مقرر تھا۔ وہ بیک وقت داروغہ اور سوداگر تھا۔

وُہ ظالم تھا۔ اس نے کبھی اوراک سے کام نہ لیا تو وُہ تند خو ہونے کی بجائے محنت دل خاسا گر ایک لمحہ وہ مصروف مزاح اور شادماں ہوتا۔ تو دوسرے لمحہ وہ تند خو اور بد مزاج ہوتا۔ اس کا تعلق نسلِ انسانی کی اس جماعت سے تھا جس کے افراد میں نئے خیالات جذب کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی —— جو لازماً ہر حادثہ سے متاثر نہیں ہوتے۔ نفرت و حقارت کے ناپاک جذبات جن کے قلوب میں پرورش پاتے ہیں جو اس چوب خشک کی مانند ہیں جس کا ایک سِرا جل رہا ہو۔ مگر دوسرا برف کی مانند سرد۔

اس وار مخد کی سیرت میں ہٹ دھرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی ضدی فطرت پر اس قدر نازاں تھا۔ کہ اپنے تئیں نپولین تصور کرتا۔ یہ محض فریب نظر تھا وہ شمع کو درخشندہ ستارہ سمجھے بیٹھا تھا جب کبھی وہ ذلیل حرکت پر آمادہ ہوتا تو وہ ضرور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے۔ کہ جب کبھی ہم افساد بلا کے اسباب وعلل پر غور کرتے ہیں۔ تو ہم سب اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس کی ابتدا ضد اور اعتماد نفس سے ہوئی۔

ہمارا ناظم اس سیرت کا حامل تھا۔ اسے سوسائٹی نے دوسروں پر حکمران کر رکھا تھا۔ اس کی مثال بعینہٖ اس شخص کی مانند تھی۔ جو دبی ہوئی راکھ سے چنگاریوں کی جستجو کرتا ہو۔ مگر اکثر اس قسم کی چنگاریاں برق کی صورت میں نمودار ہو کر گلشن ہستی کو بیابانوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کلاڈ ے گیو کے زندان میں داخل ہوتے ہی اُسے مجرموں کا لباس پہنا دیا گیا۔ اور ورکشاپ میں کسی کام پر لگا دیا گیا۔ ناظم کی نگاہوں نے تھوڑے دنوں کے بعد ہی تاڑ لیا۔ کہ کلاڈ ے گیو دیگر مجرموں کی طرح نہ تھا۔ اس لئے اس نے اس کی اچھی طرح نگہداشت کرنی شروع کر دی۔

کلاڈ ے زندان میں بہت مغموم رہتا تھا۔ اس کا نقطۂ نظر صرف اس کی بیوی اور بچے کی یاد تھی۔ جس کی امید پر وہ زندگی کی تاریک گھڑیاں صبر و تحمل سے گذار دینے پر آمادہ تھا۔ کلاڈ ے کو حسرت و یاس کا مجسمہ دیکھ کر ناظم نے اس کا غم غلط کرنے اور حوصلہ افزائی کے لئے اسے بتلایا۔ کہ اس کی عورت بیسوا طبقہ میں شامل ہو چکی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بیسوا کا لباس پہن چکی ہے۔

"اور لڑکا"، قیدی نے پوچھا۔

اس کے متعلق ناظم کو کچھ علم نہ تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد کلاوے اس زندگی سے مانوس ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ وہ خیالات جو اس کی پریشانی کا باعث تھے۔ محو ہوگئے — اس کے چہرے سے اب آہنی ارادے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اس زندگی اور اس عرصہ کو خندہ پیشانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ خواہ وہ کیسی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔

کلاوے کی ہستی جیل میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی۔ اپنے ہم اسیر قیدیوں کے درمیان اس کا بہت رتبہ تھا۔ وہ تمام اس کی عزت کرتے اور اس سے اپنی اپنی مشکلات بیان کرکے مشورہ لیتے۔

تین ماہ سے کم عرصہ میں کلاوے نے ہر شخص کے دل میں جگہ کرلی۔ اور اسی عرصہ میں ورکشاپ کے قیدیوں کا لیڈر بن گیا۔ وہ سب اس کی پرستش کرتے۔ حتیٰ کہ کئی دفعہ وہ گمان کرنے لگتا۔ کہ وہ بادشاہ ہے۔ ایک امیر یا پیر ہے۔ اپنے معتقدوں کے درمیان یہ لازمی امر تھا۔ کہ یہ ہر دلعزیزی اور شہرت دیگر افراد کے دلوں میں حسد کی چنگاریاں پیدا کرتی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ محافظوں کے دلوں میں کلاوے کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا — یہ اجنبی بات نہ تھی — ہر دلعزیزی اور نفرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے — مگر غلاموں کی محبت، آقا کی حقارت اور نفرت سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔

بدقسمتی سے کلاوے بسیار خور واقع ہوا تھا۔ اس کی بھوک مٹانے کے لئے اس کی اپنی غذا ناکافی تھی۔ آزادی کے ایام میں وہ محنت سے اپنی پوری غذا مہیا کرلیتا مگر دورانِ اسیری وہ دن بھر کام کرتا۔ تو بھی اسے پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا۔ وہ ہمیشہ بھوکا رہتا۔ مگر اس کی شکایت کے الفاظ اس کی زبان پہ ہرگز نہ آتے۔ وہ اسی خصلت کا مالک تھا۔

ایک روز جبکہ کلاوے اپنا کھانا ختم کرکے کام میں مشغول ہوا چاہتا تھا۔ اس

"فہط" کو اپنے کام میں محو کرنا چاہتا تھا۔ کہ ایک دبلا پتلا قیدی ایک ہاتھ میں پیالہ تو دوسرے میں کھانا پکڑے ہوئے اس کی جانب آیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ جھجک گیا۔

"کیا چاہتے ہو تم" کلاڈے نے اس سے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

"ایک عنایت"

"عنایت؟"

"میرے پاس ضرورت سے زیادہ کھانا ہوتا ہے۔ مہربانی فرما کر اس میں سے تھوڑا سا آپ لے لیا کریں"

کلاڈے کی آنکھیں نمناک ہوگئیں بغیر کسی تکلف کے اس نے کھانے کے دو حصے کیے۔ اور اپنا حصہ کھانا شروع کر دیا۔

"شکریہ! مگر کیا ہی اچھا ہو۔ کہ آپ ہر روز اسی طرح میرے کھانے میں حصہ لے لیا کریں" اس لڑکے نے مؤدبانہ کہا۔

"تمہارا نام؟"

"ایلبن"

"تم یہاں کس طرح آئے"

"چوری کے جرم میں"

"خیر میرا بھی یہی جرم ہے۔"

ایلبن بیس سال کا نوجوان تھا۔ مگر غیر معمولی کمزوری سے پندرہ سال کا معلوم دیتا تھا۔ کلاڈے گو ۳۵ سال کا تھا۔ مگر بسا اوقات پچاس سال سے بھی زیادہ عمر کا معلوم دیتا۔

ان دونوں کا رشتہ آپس میں باپ بیٹے جیسا تھا۔ ایلبن ابھی بچہ تھا۔ اور کلاڈے پیش از وقت بوڑھا۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ مشقت کرتے۔ ایک ہی جگہ سوتے۔ وہ

بہت خوش تھے۔ ـــــ وہ ایک دوسرے کیلئے دنیا تھے۔

ہم جیل کے ناظم کے متعلق اس سے پیشتر بھی ذکر کر چکے ہیں۔ کہ کلاڈے کا وجود اس کی نگاہ میں خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ کلاڈے قیدیوں کی نظروں میں بہت وقعت رکھتا۔ اور وہ اس کا ہر حکم ماننے کے لئے بسر و چشم حاضر رہتے۔

ایک مرتبہ جیل میں کسی قسم کی شورش پیدا ہوگئی۔ اور قیدیوں نے ناظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ناظم اور محافظوں نے لاکھ سر پٹکا مگر کچھ بن نہ آئی لیکن کلاڈے کے دو الفاظ نے ان سب کو جھکا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حسد کی چنگاری نے اب آگ کی صورت اختیار کر لی۔ اصلاح شدہ مجرم کی صورت اس لئے نفرت پیدا کر گئی ـــ راستی پر توت کے غلبہ کی عیاں مثال۔

اس نوعیت کی نفرت جو سینہ میں خفیہ طور پر پرورش پاتی رہے۔ اس آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہے جس نے برسوں آگ نہ اگلی ہو۔

ایلبن کی رفاقت نے کلاڈے کو ناظم کے وقار سے بالکل غافل کر دیا تھا۔ ایک روز جبکہ دونوں کام میں مشغول تھے۔ ایک وارڈر آیا۔ اور ایلبن سے ناظم کے روبرو پیش ہونے کو کہا۔

"تمہیں ناظم نے کیوں بلا بھیجا ہے؟" کلاڈے نے ایلبن سے پوچھا۔

"معلوم نہیں"

ایلبن وارڈر کی معیت میں ناظم کے پاس چلا گیا۔ سارا دن گذر گیا۔ مگر ایلبن واپس نہ آیا ـــ بے سود اس کا انتظار کرتا رہا۔ رات ہونے پر بھی جب وہ نہ آیا تو نہایت بیقراری کی حالت میں اپنے محافظ سے پوچھا۔

"ایلبن بیمار ہے کیا؟"

"نہیں تو!" محافظ نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ وہ دن بھر سے غائب ہے"
"تمہیں معلوم نہیں۔ اس کا کمرہ تبدیل کر دیا گیا ہے" محافظ نے لاپرواہی سے کہا۔
محافظ کے اس جواب پر کلاڈے کا ہاتھ جس میں وہ شمع پکڑے ہوئے تھا۔ کانپا۔
"کس کے حکم سے ؟" کلاڈے نے تحمل سے کہا۔
"موسیو ڈی ۔۔۔ کے حکم سے ۔۔۔" یہ ناظم کا نام تھا۔

دوسرے روز شام کو ناظم حسب معمول کام کی دیکھ بھال کیلئے آیا۔ کلاڈے نے اسے دیکھتے ہی اپنی اونی ٹوپی سنبھالی۔ اور کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے پھاٹک کے قریب کھڑا ہو گیا ۔۔۔ یہ زنداں کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

جب ناظم اس کے قریب سے گذرا۔ تو کلاڈے نے مؤدبانہ لہجہ میں کہا۔
"جناب"
ناظم مڑا۔
"جناب! کیا واقعی آپ نے البین کو دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا ہے"
"ہاں" ناظم نے جواب دیا۔
"جناب میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے لئے اپنا کھانا ناکافی ہوتا ہے۔ اس لئے البین اپنے کھانے سے کچھ حصہ مجھے دیدیا کرتا تھا۔
"مگر مجھے اس سے کیا سروکار ؟"
"جناب! کیا آپ اتنی عنایت نہیں کر سکتے کہ البین کو پھر میرے پاس واپس بھیج دیں"
"ناممکن! میرے احکام میں تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی"
"یہ حکم کس کا ہے ؟"
"میرا!"

"تو پھر خیاب ہی پر میری زندگی کا انحصار ہے"
میرا حکم تبدیل نہیں ہو سکتا۔
"جناب! کیا آپ کو مجھ سے عداوت ہے؟"
"نہیں"
"تو پھر آپ ایلبین کو مجھ سے کیوں جدا کر رہے ہیں"
"اس لئے کہ یہ میری خواہش ہے۔"
یہ کہہ کر ناظم چلا گیا۔ کلاڈے اس شیر کی مانند جو اپنے شکار سے محروم کر دیا گیا ہو۔ سر جھکائے کھڑا تھا۔
ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ غم کلاڈے کی بھوک میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ وہ پہلے کی طرح ہی بھوکا رہا۔ اور بہت سے قیدیوں نے برضا و رغبت اپنا کھانا اسے پیش کرنا چاہا۔ مگر اس نے خندہ پیشانی سے انکار کر دیا۔
کلاڈے حسب معمول خاموشی سے اپنا کام کرتا۔ اور ہر روز شام کو ناظم سے پُر درد اور غصہ آمیز لہجہ میں ——— دعا اور دھمکی کے مابین صرف دو الفاظ کہتا ——— "اور ایلبین" مگر اس کے جواب میں ناظم کا یہ طرزِ عمل کسی حالت میں بھی قابل ستائش نہ تھا۔ اور یہ بھی صاف عیاں تھا کہ کلاڈے نے اس طرزِ عمل کے انسداد کیلئے کوئی تہیہ کر لیا ہوا ہے تمام زندان ہٹ دھرمی اور آہنی ارادہ کے درمیان فیصلہ کن جنگ دیکھنے کا منتظر تھا۔
ایک روز وہ ناظم سے یہ کہتا ہوا سنا گیا۔
"جناب! ایلبین کو میرے پاس بھیج دیجئے۔ کیونکہ آپ کی اسی میں بہتری ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میرے الفاظ مت بھولئے آپ!"
ایک اتوار کو وہ گھنٹوں سر کو زانوؤں میں دیئے صحن میں بیٹھا رہا۔ اور جب ایک قیدی امیٹ نے اس سے پوچھا۔ کہ وہ کیوں مغموم سا ہے۔ تو کلاڈے نے سر کو اوپر اٹھاتے

ہوئے جواب دیا۔

"میں کسی شخص کا فیصلہ مرتب کرنے میں مصروف ہوں۔"

۲۵ راکتوبر ۱۸۳۱ء کی شام کو کلاڈے نے اپنی گھڑی کا شیشہ زمین پر اس غرض سے پھینکا۔ کہ ناظم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے۔ وُہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا ـــــ ناظم آیا۔

"یہ شیشہ میں نے پھینکا تھا۔ جناب، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ میرے رفیق کو میرے پاس بھیج دیجیئے" غلام نے کہا۔

"ناممکن ہے۔" آقا نے جواب دیا۔

"آپ کو ایسا کرنا پڑے گا" کلاڈے نے کہا۔ اور ناظم کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے نہایت استقلال سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھئے آج اکتوبر کی ۲۵ ہے۔ میں آپ کو ۴ نومبر تک اس معاملہ پر سوچنے کی مہلت دیتا ہوں"

ایک وارڈر جس نے یہ الفاظ سنے۔ دھمکی پر تعبیر کیئے۔ اور ناظم سے کلاڈے کے لئے سزائے تخلیہ تجویز کی۔ مگر ناظم نے اس بات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ وُہ اُن الفاظ سے خائف نہ ہوا۔

دوسرے روز ایک اور قیدی نے کلاڈے کی مغموم طبع کے بارے میں سوال کیا

"کلاڈے تم کن خیالات میں غرق رہتے ہو۔"

"مجھے ڈر ہے۔ کہ ہمارے اچھے ناظم پر کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے" کلاڈے نے جواب دیا۔

۲۵ راکتوبر اور ۴ نومبر میں پورے نو دن باقی تھے۔ اس قلیل مدت کے بعد ناظم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

کلادے ہر روز ناظم کے گوش گزار کر دیتا۔ کہ وہ ایلین کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِن گزارشوں سے ناظم تنگ آ گیا۔ اور ایک روز اسے چوبیس گھنٹہ کی سزائے تخلیہ دیدی —— رضاکارانہ عجز و انکسار کا جواب۔

۹ر نومبر آ پہنچا۔ اس صبح کلادے نہایت اطمینان قلب سے خواب سے بیدار ہوا۔ گذشتہ ایام کی یادگاریں نکالیں۔ تاکہ انہیں جی بھر کے ایک دفعہ دیکھ لے۔ ایک قینچی اور ایک کتاب جو اس ہستی کی ملکیت تھی جسے وہ جان سے زیادہ عزیز جانتا تھا یعنی اس کی بیوی۔ ان عزیز چیزوں کو جیب میں رکھ کر وہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ کہ ایک قیدی اس کی نظر پڑا۔ جو موٹی موٹی آہنی سلاخوں کے درمیان سے اس کی طرف متجسسانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"آج رات کو میں ان سلاخوں کو قینچی سے کاٹ ڈالوں گا"۔ کلادے نے قینچی دکھاتے ہوئے کہا۔ قیدی اس ناممکن اور محیر العقول بات کو سن کر ہنسنے لگا۔ کلادے بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔

اس دن اس نے غیر معمولی انہماک سے کام کیا۔ تاکہ اس چیز کی تیاری میں کوئی نقص باقی نہ رہ جائے۔ جس کے عوض اسے کھانا ملتا تھا۔

دوپہر سے کچھ پہلے وہ کسی بہانہ سے چوب سازوں کے کمرہ میں چلا گیا۔ جہاں قیدیوں نے اس کا پرجوش استقبال کیا —— کلادے کی ہر جگہ عزت تھی۔ وہ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جیسے وہ اس کے منہ سے کوئی کلمہ سننے کیلئے بیتاب ہوں۔ کلادے نے کمرہ میں نگاہیں دوڑائیں۔ اور مطمئن ہو کر جیل کا کوئی وارڈر اس وقت موجود نہ تھا۔ یوں گویا ہوا۔

"کیا تم میں سے کوئی مجھے اپنی کلہاڑی دے سکتا ہے"؟

"کس غرض کے لئے"، انہوں نے دریافت کیا۔

"ناظم کو قتل کرنے کی خاطر" اس نے فوراً جواب دیا۔
اس پر سب نے اپنی اپنی کلہاڑیاں پیش کیں۔ کلاوے نے ان سب میں سے چھوٹی کلہاڑی منتخب کر کے اسے اپنے کوٹ کے دامن میں چھپا لیا۔

اس وقت ستائیس قیدی موجود تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی اس راز کو افشا نہ کیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس واقعہ کے بعد اس موضوع پر گفتگو تک نہ کی۔ مگر وہ آنے والے حادثہ کے منتظر تھے۔ وہ حادثہ گو ہولناک تھا مگر بہت آسان۔

صحن سے گذرتے ہوئے کلاوے کو ایک قیدی ٹہلتا ہوا ملا جس نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کوٹ میں کیا چھپائے ہوئے ہے۔

"ایک کلہاڑی، موسیو ڈی ——— کے قتل کرنے کیلئے، تمہیں نظر آ رہی ہے کیا؟" کلاوے نے کہا۔

"بہت کم" قیدی نے جواب دیا۔

دن کا بقایا حصہ حسب معمول مصروفیتوں میں گذر گیا۔ سات بجے شام قیدی اپنے اپنے ورکشاپوں میں منتقل کر دیئے گئے۔ تاکہ ناظم انکی حاضری لے سکے۔ کلاوے روز مرہ کی طرح اپنے ہم اسیروں کے ساتھ ایک بڑے سے ورکشاپ میں بند تھا۔ اس وقت اپنی قسم کا واحد واقعہ پیش آیا۔

کلاوے نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر مندرجہ ذیل تقریر شروع کی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ ایلبن اور مجھ میں ایک بھائی کا رشتہ تھا۔ اول اول میری پسندیدگی کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ وہ اپنا کھانا میرے ساتھ تقسیم کرتا۔ مگر بعد ازاں وہ پسندیدگی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ جب وہ میرے ساتھ الفت کا اظہار کرنے لگا۔

ہم دونوں کی وابستگی موسیو ڈی ——— کیلئے کسی حالت میں بار خاطر نہ تھی۔ مگر اس نے صرف ہٹ دھرمی اور حسد کی خاطر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

صرف اس لئے کہ وہ بدخصلت ہے۔

میں نے اس سے بارہا التجا کی۔ کہ وہ ایلین کو میرے پاس واپس بھیج دے۔ مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر کار میں نے تم سے ۴ر نومبر تک اس معاملہ پر سوچنے کے لئے کہا جس پر مجھے سزائے تخلیہ دی گئی۔ میں نے اسے ترازوئے عدل میں تولا تو اسے سزائے موت کا مستحق پایا۔ چنانچہ میں نے اسکی موت کا دن ۴ر نومبر مقرر کیا ہے۔ وہ ابھی ابھی یہاں آئیگا۔ میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ میں اسکی جان لینے پر تلا ہوا ہوں کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔؟"

قبر کی خاموشی چھا گئی۔

کلاڈ نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اور اپنے رفیقوں ـــ اکیاسی چوروں سے وجوہات بیان کرنی شروع کیں۔ جو اس عمل کی محرک ہوئی تھیں۔

"میں اس خطرناک اقدام پر اس لئے مجبور ہوں۔ کہ راستی پر ہوں۔ اس لئے کہ اس نے مجھے سخت روحانی تکلیف پہنچائی ہے۔ اس لئے کہ میں دو ماہ کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس اقدام کے معنے میری موت ہے۔ چونکہ میں راستی پر ہوں۔ اس لئے مجھے اپنی قربانی کی کوئی پرواہ نہیں اگر تم میں سے کوئی اس کے خلاف کہنا چاہتا ہے تو وہ علانیہ کہے۔"

اس قبر جیسی خاموشی میں صرف ایک آواز نے چلا کر کہا۔

"مگر قتل کرنے سے پیشتر تمہیں پھر اسے ایک دفعہ متنبہ کرنا چاہئے۔"

"درست ہے۔ میرے دوست میں اسے مہلت دے دونگا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی چند ایک ٹکٹیں جو اسے نہایت عزیز تھیں، ان قیدیوں میں تقسیم کر دیں۔ بلکن قینچی اپنے پاس رکھ لی۔ ہر ایک قیدی سے بغلگیر ہوا۔ ان میں سے اکثر اس منظر کو بغیر آنسو بہائے نہ دیکھ سکے۔

کلادے حسب معمول خوش گپیوں میں مشغول ہو گیا۔ اس کو اس طرح دیکھ کر بعض نے خیال کیا کہ وہ اس خوفناک ارادہ سے باز آگیا ہے۔

ایک نوجوان قیدی کلادے کے خوفناک ارادہ سے ابھی تک متالف ایک کونے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔

"نوجوان آدمی! ہمت کرو بس ایک لمحہ کا کام ہے۔" کلادے نے اس سے کہا۔

کلادے نے ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ اور الوداع کہنے کے بعد سب کو حکم دیا۔ کہ وہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہو جائیں۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

وہ خود بھی اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اچانک گھڑی کے گجر کی آواز سنائی دی۔ اس پر وہ اُٹھا۔ اور دروازے کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلا۔ اور ناظم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ حسب معمول نہایت اطمینان سے کسی حادثہ سے بے خبر گذر رہا تھا۔ کہ مڑتے پیچھے کسی کی آہٹ سن کر مڑا۔ تو کلادے کو کھڑا پایا۔

"تم اس جگہ کیا کر رہے ہو۔ اپنی جگہ پر کیوں نہیں جاتے۔" ناظم نے پوچھا۔

"میں جناب سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" کلادے نے مودبانہ کہا۔

"وہ کیا؟"

"البین کی واپسی۔"

"پھر وہی ضد"

"ہمیشہ رہے گی"

"معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہارے لئے ۲۴ گھنٹہ سزائے تخلیہ ناکافی تھی۔" ناظم نے وہاں سے چلتے ہوئے کہا۔

"جناب میرا رفیق مجھے واپس عنایت کیجئے۔" کلادے نے اس کے پیچھے چلتے

ہوئے کہا۔

"ایسا ہونا ناممکنات سے ہے" ناظم نے جواب دیا۔

"جناب میں پھر ایک دفعہ التجا کرتا ہوں۔ کہ میرے رفیق کو میرے پاس بھیجد بجئے۔ پھر آپ دیکھیں گے۔ کہ میں کس طرح دل لگا کر کام کرتا ہوں۔ آپ آزاد ہیں اس لئے آپ اس شخص کے احساسات قلب کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس کا دنیا میں ایک ہی دوست ہو۔ ایک ہی رہا سہا سہارا ہو۔ زندان کی چاردیواری میں اس رفیق کی موجودگی ہی میرے لئے دنیا کی عزیز ترین نعمت ہے۔ آپ آزادانہ چل پھر سکتے ہیں۔ آپ کے لئے دنیا میں سب کچھ موجود ہے۔ مگر میرے لئے ایلین ہی دنیا ہے۔ خدا کیلئے! اسے میرے پاس بھیجد یجئے۔ یہ بھی آپکو معلوم ہے۔ کہ وہ اپنا کھانا میرے ساتھ تقسیم کیا کرتا تھا۔ اگر ایک تیرہ بخت انسان کلادے اس جگہ اپنے رفیق کے ساتھ تنہائی کے ایام بسر کرے۔ تو اس میں آپ کا کیا ہرج ہے۔ آپ سے صرف اجازت چاہتا ہوں ـــــ صرف ہاں"

جناب! میرے اچھے جناب! میں خدا کے نام پر ملتجی ہوں کہ میری گذارش کو قبول فرمایئے۔

یہ کہہ کر کلادے جذبات کا طوفان سینہ میں دبائے ناظم کے جواب کا منتظر تھا۔

"یہ کبھی نہ ہوگا! میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں۔ کہ میرے احکام میں تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ جاؤ تم ستارہے ہو" یہ کہہ کر ناظم نے دروازہ کی جانب رُخ کیا۔

ایکا سی چہروں پر قبر جیسی خاموشی طاری تھی۔

کلادے نے ناظم کے کندھے کو چھوا اور کہا "مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ آخر کن وجوہ کی بنا پر آپ میرے ساتھ ظلم کر رہے ہیں"

"اس لئے کہ یہ میری مرضی ہے" ناظم نے جواب دیا۔

یہ جواب سُنکر کلاوے ایک قدم پیچھے ہٹا ۔ ایک سو باسٹھ[۱۶۲] آنکھوں نے اُسے کوٹ سے کلہاڑی نکالتے ہوئے دیکھا ۔ ایک لمحہ میں ناظم کی لاش زمین پر بے جان پڑی تھی۔ تین ضربوں نے اس کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے کلہاڑی کی چوتھی ضرب سے اس کی شکل پہچاننی مشکل تھی۔

کلاوے نے جو غصہ و انتقام سے اندھا ہو رہا تھا ایک اور کلہاڑی ناظم کی بے جان لاش پر پورے زور سے ماری ۔ مگر بے فائدہ ناظم پہلے وار سے ہی سرد ہو چکا تھا ۔ کلہاڑی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کلاوے چلایا " اب دوسرا :

دوسرا ؟ وہ خود آپ تھا ۔ اپنی بیوی کی قینچی نکال کر اس نے اپنی چھاتی میں پیوست کر لی ۔ مگر حسب مقصود نتیجہ نہ نکلا ۔ قینچی اس کی مضبوط چھاتی میں اچھی طرح نہ جا سکی قینچی سے بیس وار کیے ۔ اور کیے ۔ مگر بے سود ۔ آخر کار چلایا ۔ لعنت ! دل کی جگہ ہی نہیں ملتی " اتنا کہا ۔ اور خون آلود بے ہوشی کے عالم میں زمین پر گر پڑا ۔

" بتایئے ان دونوں میں سے کون کس کا شکار تھا ۔ ؟

جب کلاوے نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو پٹیوں سے ملبوس ہسپتال میں پایا ۔ اس کے آس پاس ہسپتال کی نرسیں کھڑی تھیں ۔ ان میں سے ہر ایک نے اس کی طبیعت کا حال پوچھا ۔

خون کی مقدار اس کے بدن سے خارج ہو چکی تھی ۔ اور قینچی کے زخم بہت خطرناک صورت اختیار کر گئے تھے ۔ مگر سب سے مہلک ضربات وہ تھیں ۔ جو موسیو ڈی کے جسم پر پڑیں ۔

ہوش آنے پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی ۔ ناظم کے قتل کے بارے میں اس سے سوالات کئے جانے لگے ۔ ان کے جواب میں اس نے بہادرانہ طور پر اعتراف جرم کر لیا ۔

تھوڑے دنوں بعد اس کے زخموں نے نہایت خوفناک صورت اختیار کر لی۔ جس کی وجہ سے اس کے جسم کی حرارت بہت تیز ہو گئی۔

نومبر۔ دسمبر، جنوری اور فروری علاج معالجہ میں ہی گزر گئے۔ معالج اور منصف دونوں اس کی حالت دیکھنے آتے ــــ معالج اس کا علاج کرنے اور منصف تختہ دار مہیا کرنے کے لئے۔

خیر ۱۶ مارچ ۱۸۳۲ء کو جب کلادے بالکل روبہ صحت ہو گیا۔ تو اس کا مقدمہ ٹرائے کی عدالت میں پیش ہوا۔ کمرہ عدالت تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

کلادے کی ظاہری صورت نے ججوں کے دل میں اس کی نسبت اچھی رائے قائم کر دی۔ اس کا خط لیا ہوا تھا۔ وہ ننگے سر مجرموں کے لباس میں کٹہرے کے نزدیک کھڑا تھا۔

سرکاری وکیل نے بطور حفظ ماتقدم دروازوں پر پولیس افسر مقرر کر دیئے تھے۔ تاکہ ان قیدیوں کے درمیان جو اس مقدمہ کے گواہ تھے۔ کوئی گڑبڑ واقع نہ ہو جائے۔ دوران مقدمہ ایک نئی مشکل پیش آئی۔ ان گواہوں یعنی قیدیوں میں سے کوئی شخص بھی اس معاملہ کے متعلق گفتگو کرنے کو تیار نہ تھا۔ ججوں اور انسپکٹر دل نے دھمکیاں دیں۔ مگر بے سود۔ وہ کلادے کے خلاف ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نکالنے کے لئے تیار نہ تھے۔

کلادے کا اصرار اور ہدایت ہی صرف اُن کی زبان کھلوا سکی جس پر انہوں نے چشم دید حالات کو من وعن سنا دیا ــــ جہاں کہیں وہ اس خونی داستان کے بیان دینے میں رُک جاتے۔ کلادے اُن کو صحیح واقعہ تبلا دیتا۔

اِس منظر کو دیکھ کر کمرہ عدالت میں موجود عورتوں کی آنکھوں سے آنسو

وہاں تھے۔ اب نقیب نے ایلین کو پکارا۔

ایلین مذور جذبات سے متاثر سرتاپا تھرتھراتا ہوا آیا۔ اور آتے ہی اپنے آپ کا کلادے کی باہوں میں ڈال دیا۔

"یہ وہی بدبخت انسان ہے۔ جس نے ایک بھوکے کو روٹی کھلائی ——"

کلادے نے سرکاری وکیل کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر وہ ایلین کی طرف بڑھا۔ اور اس کے ہاتھوں کا بڑی محبت سے بوسہ لیا۔

جب سب گواہوں کا بیان ہو چکا تو سرکاری وکیل اٹھا اور جیوری کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا:۔

"جیوری کے جملہ اراکین اسوسائٹی کو بہت رنج ہوگا۔ اگر اس قسم کے قاتلوں کو سزائے موت نہ دی گئی۔ جس نے ——"

سرکاری وکیل کے بیان کے بعد کلاڈے کے وکیل نے جرح کی ——

جرح جو عموماً ایسی نام نہاد عدالتوں میں اس موقع پر ہوا کرتی ہے۔

کلاڈے کا بیان ہوا۔ تو حاضرین کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جب انہوں نے ایک غریب اور جاہل مزدور سے ایک فاضل مقرر کے سے الفاظ سنے بغیر کسی لغزش کے کلاڈے نے تمام واقعات کمال راستبازی سے بیان کر دیئے۔ وہ کٹہرے میں اس انداز سے کھڑا تھا۔ جیسے وہ سچ بولنے پر تلا ہوا ہے۔

دوران بیان بعض دفعہ ایسا موقع آتا کہ ہجوم پر اس کے ہر لفظ کا اثر دکھائی دیتا۔ اس شخص ـــ علم سے محض نابلد شخص نے اس دوران بہت سے وزنی دلائل پیش کیے۔ جن کی اس سے توقع نہ تھی۔ مگر دورانِ گفتگو میں اس نے ادب کو ہاتھ

سے نہ جانے دیا۔ لیکن جب سرکاری وکیل نے یہ کہا۔ کہ قتل کی واردات فوری غصہ اور رنج کا باعث نہ تھی۔ تو کلاوسے کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔

مجھے رنج پہنچا تھا کیا؟ درست ہے۔ اگر کوئی شراب سے مخمور مجھ پر حملہ کرتا۔ اور میں اُسے جان سے ہلاک کر دیتا۔ تو تم اس فعل کو فوری غصہ پر تعبیر کرتے۔ سزائے موت کو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیتے۔ مگر ایک شخص نے جس نے ہر ممکن طریقہ سے مجھے مجروح کرنا چاہا۔ جو متواتر چار سال میری ذہنی اذیت کا باعث رہا جس نے اسی قدر عرصہ تک مجھے ذلیل بنائے رکھا۔ جو ہر روز میرا تمسخر اڑاتا۔ جس کا دن کے چوبیس گھنٹے اور چار سال تک یہی مشغلہ رہا کہ وہ اپنے ترکش کے تیر مجھ پر خالی کرتا رہے۔ جب میں نے اپنے مصائب و نوائب کے منبع کو بند کیا۔ تو تم کہتے ہو۔ کہ وہ عمل فوری غصہ سے محرک ہوا۔

میرے ساتھ ایک عورت کا دامن وابستہ تھا۔ جس کی خاطر میں نے چوری کی۔ وہ اس کی بابت میرے احساسات مجروح کرتا رہا میں ایک بچے کا باپ تھا جس کی خاطر میں نے ایسا رذیل کام کیا۔ وہ اس بچے کی باتیں سنا سنا کر میرے زخموں پر نمک پاشی کرتا رہا۔ میں بھوکا تھا۔ ایک دوست نے مجھے اپنا کھانا پیش کیا۔ وہ اس دوست کو مجھ سے جدا کر کے گیا۔

میں نے اس کی خدمت میں التجا کی۔ اس نے مجھے اندھیری کوٹھڑی میں دھکیل دیا۔ جب میں نے اپنی تکلیفات کا اظہار کیا۔ تو اُس نے جواب دیا۔ کہ اس کے کان ایسی باتوں کی سماعت کے لئے تیار نہیں۔

اگر تم میری جگہ ہوتے۔ تو کیا کرتے؟

میں نے ان مصیبتوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس شخص کو جو میری قلبی تکلیفات کا باعث تھا قتل کر دیا۔ تم اس قتل کو وحشیانہ عمل گردانتے ہو کہتے ہو۔

کہ مجھے صعوبات نہیں پہنچائی گئیں۔ سو تم میرا سر قلم کرنے کے درپے ہو۔ بصد خوشی کرو۔ میرا سر تمہارے ہاتھوں کا کھلونا بننے کے لئے حاضر ہے۔"

انسانی قانون اس نوعیت کے فوری غصہ کو اس قسم کے مظالم کا فیصلہ کرتے وقت پیش نظر نہیں رکھتا صرف اس لئے کہ اس وار کے نشانات غیر مرئی ہوتے ہیں جیوری بحث ختم ہوتے ہی فیصلہ مرتب کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اور کلاڈے کے اس فعل کو خونریزی کا ایک سنگین عمل قرار دیا۔ اور اس کی زندگی کا نقشہ یوں کھینچا۔ کلاڈے کی زندگی کی ابتدا ایک ایسی لڑکی سے ہوئی۔ جو اس کی بیاہتا نہ تھی۔ اس نے چوری کی۔ پھر قتل کیا۔ یہ سب کچھ سچ تھا۔

فتویٰ صادر کرنے سے پیشتر جیوری نے کلاڈے سے دریافت کیا کہ آیا اسے اس بارے میں کچھ اور کہنا ہے۔

"بہت کم! میں چور ہوں۔ قاتل ہوں۔ میں جملہ اراکین جیوری سے صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ کونسا امر تھا جس نے مجھے چوری کرنے پر مجبور کیا۔ وہ کونسی شے تھی۔ جو میرے قاتلانہ حملہ میں محرک ہوئی؟"

جیوری بغیر جواب دیئے دوسرے کمرے میں فیصلہ مرتب کرنے کی خاطر چلی گئی۔ شہر کے ان بارہ معززین۔ ان نام نہاد اراکین نے کلاڈے پر موت کا فتویٰ صادر کیا۔ فیصلہ کرتے وقت ان کے پیش نظر کلاڈے کا دوسرا نام "گیو" یعنی بدمعاش بھی تھا۔ جو خاص طور پر ان کے فیصلہ کرنے میں محرک ہوا

جب حکم سنایا جا چکا تو کلاڈے نے صرف اس قدر کہا۔ مجھے یہ سزا قبول ہے۔ مگر مقام تاسف ہے۔ کہ انہوں نے میرے دو سوالات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے چوری کیوں کی؟ اور میں نے قتل کس بنا پر کیا؟

زندان میں اسی رات کو اس نے خواب میں سو کر کنا کھایا

کلاآوے نے رحم کی درخواست کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر جب اس نرس نے جس نے اس کی تیمارداری کی تھی۔ اس بات پر اصرار کیا۔ تو وہ رضامند ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رضامندی صرف نرس کی خوشنودی کی خاطر تھی۔ کیونکہ جس وقت اس کی درخواست پیش ہوئی۔ تو رحم کی درخواست کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ کلاآوے نے عمداً دیر لگا دی تھی۔

جس وقت نرس اُسے یہ خبر سنانے کیلئے آئی۔ تو وفورِ جوش اور محبت سے اُسے پانچ فرانک کا نوٹ دیا۔ جسے کلاآوے نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے پاس رکھ لیا۔

اس کے ہمراہ اسیر قیدیوں نے جو سب کے سب اس کے دامِ الفت میں گرفتار تھے۔ ہر ممکن ذریعہ سے اس کی فراری کیلئے کوشش کی۔

انہوں نے روشندان کے ذریعے کلاآوے کی کوٹھڑی میں ایک کیل کچھ تار اور ایک لوہے کا ٹکڑا پھینکا۔ ان چیزوں میں سے کوئی ایک بھی اس کی فراری کا موجب ہو سکتی تھی۔ مگر اس نے وہ سب چیزیں وارڈر کے حوالے کر دیں۔

۸ رجون ۱۹۳۲ء کو قتل کے واقعہ سے پورے سات ماہ چار دن بعد محافظ جیل کلاآوے کے پاس آیا۔ اور اُسے مطلع کر دیا۔ کہ اس کی زندگی میں اب صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس کی درخواستِ رحم مسترد کر دی گئی تھی۔

"میں نے نہایت اطمینان سے آج کی رات بسر کی ہے اور امید کرتا ہوں کہ اسی طرح آخری لمحات بھی گذار دونگا۔" کلاآوے نے محافظ سے کہا۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے آہنی ارادہ رکھنے والے انسان موت سے کبھی خائف نہیں ہوتے۔ بلکہ موت کی آمد پر نہایت عالی حوصلگی سے گفتگو کرتے ہیں۔

کلاآوے کی کوٹھڑی میں پہلے پادری آیا۔ بعد ازاں جلاد۔ پادری کے ساتھ

کلاڈے نہایت ادب اور سلوک سے پیش آیا۔ اور بہت عرصہ تک۔ دینی علوم سے نااہل ہونے پر اظہار تاسف کرتا رہا۔ اپنے آپ کو دینی معلومات سے فائدہ نہ حاصل کرنے کی بنا پر لعنت ملامت کرتا رہا۔

جلاد کے ساتھ بھی وہ ایسے ہی خلوص سے پیش آیا۔ درحقیقت اس نے اپنی روح پادری کے حوالے کر دی تھی۔ اور اپنا جسم جلاد کے۔

جب اس کے بال تراشے جا رہے تھے۔ تو کسی نے ذکر کیا۔ کہ اس گرد و نواح میں ہیضہ پھیل رہا تھا۔ اور امکان تھا۔ کہ بہت تھوڑے عرصے میں ٹرائے بھی اس موذی مرض کا شکار ہو جائے گا۔

"مجھے اس سے کیا تعلق۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہیضہ کیا کوئی مرض بھی مجھ پر اثر نہ کر سکے گا۔" کلاڈے نے متبسمانہ لہجے میں کہا۔

خودکشی کے وقت کلاڈے سے قینچی ٹوٹ گئی تھی۔ تیایا حصہ اس کے پاس ابھی تک موجود تھا۔ اس نے وصیت کی۔ وہ حصہ اس کے رفیق البین کو دے دیا جائے۔ اس کا آدھا حصہ اس کی چھاتی میں زخموں کی صورت میں پنہاں تھا۔ یہ بھی خواہش کی۔ کہ اس کا شام کا کھانا بھی اس کے دوست کو دے دیا جائے۔

اگر کچھ چیز اپنے پاس رکھی۔ تو پانچ فرانک کا نوٹ جو کہ اُسے نرس نے دیا تھا۔ وہ اُسے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ جب اُسے رسی میں باندھا گیا۔

پونے آٹھ بجے یہ ماتمی جلوس زندان سے گلوبریدی کے چبوترہ کی طرف روانہ ہوا۔ کلاڈے نہایت استقلال کے ساتھ اس چبوترہ پر چڑھا۔ اس کی آنکھیں پادری کی صلیب پر جمی ہوئی تھیں۔ جو صلیب اس کے پنہاں زخموں پر مرہم کا کام دے رہی تھی۔ اس ہیبتناک مشین پر باندھے جانے سے پیشتر اس نے پادری کو پانچ فرانک کا نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا "غریبوں کے لئے"۔

مگر چونکہ آٹھ بجے کا گجر بج رہا تھا اس لئے پادری اس شور میں کلاڈے
واتر کو نہ سن سکا۔ کلاڈے نے گھنٹہ کا شور ختم ہوتے ہی پھر ایک دفعہ پادری
مخاطب ہوتے ہوئے کہا مغربیوں کے لئے۔"
ابھی یہ لفظ اس کی زبان پر ہی تھے۔ کہ یہ شریف اور حساس سر جسم سے
ندہ ہو چکا تھا۔
سزائے موت کیلئے یوم الموت مقرر کیا گیا تھا۔ تمام روز گلو بریدی کی
ین لوگوں کے خیالات و حسیات کو منتقل کرتی رہی۔ نتیجہ ۔ ہوا ۔ کہ ہجوم کے
وں ایک ٹیکس وصول کرنے ۔ ے کا قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ کیا ان کے
ب نظر یہی منظر پر عبرت ہے
محولہ بالا واقعات صرف اس واحد غرض سے صفحۂ قرطاس پر لائے گئے ہیں
ہ تنسیخ سزائے موت ایسے مشکل اور نازک موضوع کی گتھی سلجھانے میں مدد
ں۔ کیونکہ ہمیں یقین واثق ہے۔ کہ اس انسان کا ہر لفظ بذات خود ہمارے
ریہ کے مخالفین کا جواب ہے۔ اور یہ کہ انیسویں صدی عیسوی کے اہم ترین
لہ کا حل اسی واقعہ انسان میں موجود ہے۔
کلاڈے کی زندگی میں صرف دو امر قابلِ غور و فکر ہیں۔ اولاً اس کی تعلیم
یا اس سزا کی نوعیت جو اس پر عائد کی گئی۔
مجلسی دائرہ کے لئے یہ امر باعثِ دلچسپی ہوتا۔ کہ کلاڈے ایک اچھے
د فراست کا مالک تھا۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ اس میں کس چیز کی کمی تھی۔ اس
نہ تنظیم پر انسانی معاشرت کی بلندی کا انحصار ہے۔ یہ چیز فطرت نے انسان
ی۔ سوسائٹی کا فرض ہے۔ کہ اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔
کلاڈے کی طرف دیکھئے۔ ایک بہترین دماغ اور شریف زاد محض گردآلودہ

فضا میں پرورش پانے کے باعث چور بن گیا۔ سوسائٹی نے اسے ایسے زندان میں رکھا جہاں گناہ پیشہ سے بھی زیادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ وُہ چور سے قاتل بن گیا۔ وہ قابلِ گرفت ہے۔ یا ہم؟

یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ ہم اس کے عواقب و عواطف سے غافل رہ کر اس پر غور نہیں کر سکتے۔ حقائق ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اگر حکومت ان پر غور نہ کرے تو حکام کس لئے ہیں؟ ایوانہائے سلطنت ہر سال الاکین سلطنت کی نشستگاہ بنتے ہیں۔ وہاں مداخل و مخارج پر بحث ہوتی ہے ذاتی مفاد کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم وزراء و اراکین سلطنت کو ہر ایک موضوع سے باخبر کر دیں۔ خواہ اُن کا انجام کچھ نہ ہو۔

مقننین! تم اپنا وقت محض گفتار میں بسر کرتے ہو۔ تمہاری گفتار ایک دہقانی مدرس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ لے آتی ہے۔ تم کہتے ہو۔ کہ موجودہ زمانے کے عیوب خود تمدن کے پیدا کردہ ہیں۔ گویا تم جو کیٹیا علدرا، اوڈی پس، میڈیا اور روڈدو گونا سے واقف تک نہیں۔

ایوان کے بڑے بڑے خطیب جس وقت سرگرم مباحثہ ہوتے ہیں تو فرانسیسی زبان ان کی قابلیت اور علمیت زبان پر نوحہ خوانی کرتی ہے۔ ہم اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم اس سے زیادہ اہم مضامین آغوشِ عدم میں پڑے رہتے ہیں۔ ان فضول مناظروں کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔؟

اراکین اس وقت کیا جواب دے سکتے ہیں جب ان میں سے ایک مندرجہ ذیل سوال کرے۔

"خاموش! ہر وہ شخص جو اس سے قبل گفتگو کر چکا ہے۔ خاموش رہے! آپ کو اس بات کا زعم ہے۔ کہ آپ مسئلہ کے ہر پہلو سے واقف ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے

کہ آپ بالکل تاریکی میں ہیں۔"

وہ مسئلہ یہ ہے! ایک سال ہوا "عدل و انصاف" کے نام پر۔ پیرس میں ایک شخص کے ٹکڑے اڑا دیئے گئے۔ جون میں ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پیرس میں لاتعداد افراد قتل کئے گئے۔

یہ مسئلہ ہے۔ آؤ اس پر غور کرو۔

تم! تم وہ ہو۔ جو صرف قلعی محافظ کی وردیوں پر غور کرتے ہو۔ صرف اس نکمی بحث پر وقت ضائع کرتے ہو۔ کہ سپاہیوں کی وردیوں کے بٹن سفید ہوں یا زرد۔

حضرات! صرف عوام الناس تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ خواہ حکومت شخصی ہو۔ یا جمہوری۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ غربا بدستور مصائب کا شکار رہتے ہیں۔ لوگ مفلسی کے ہاتھوں تنگ ہیں۔ ان کا خون رگوں میں سرد ہو چکا ہے۔ وہ زندہ درگور ہیں۔ یہی سیاہ بختی۔ انہیں جرائم کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے بیٹے جیلوں کو آباد کرتے ہیں۔ اور لڑکیاں عشرت کدوں کی زینت بڑھاتی ہیں۔

تمہارے ہاں لاتعداد مجرم اور بے شمار عصمت فروش موجود ہیں۔ مجلسی بدن کی رگوں میں بدی کا خون موجزن ہے۔ تم بیمار کے قریب ہو۔ اس کی عیادت کرو اس کی صحت کے لئے کوئی نسخہ تیار کرو۔

تم سب غلطی پر ہو۔ مسئلہ پر نہایت غور و فکر سے سوچو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ تمہارے قوانین کا نصف حصہ ہے۔ تمہارے روزمرہ کے کاروبار کا۔ اور دوسرا نصف تمہاری چاپلوسی کا۔

تم مجرموں کے جسموں پر داغ دیتے وقت ان کے مکتوب حیات پر جرائم کی مہر لگاتے ہو۔ تم اس سزا کے وارث پیدا کرتے ہو کبھی جدا نہ ہونے والے ساتھی۔

وارث اور مجرم۔

جیل خانے اصلاح کی بہ نسبت افساد کا مرکز ہیں۔ جہاں تک سزائے موت کا تعلق ہے۔ وہ ازمنہ بربریت کی آخری یادگار ہیں۔ اس لئے داغ دینا۔ زندان اور سزائے موت سب ایک ہی شجر کے اثمار ہیں۔ تم نے داغ کی سزا موقوف کر دی ہے۔ مگر باقی ماندہ سزاؤں کا بھی خاتمہ کرو۔ جب تم نے آہنی سلاخ کو توڑ دیا تو پھر جلاد اور زندان کی کیا ضرورت ہے۔ اس زینہ کو جو بامِ جرم کی طرف لئے جاتا ہو۔ اتار دو۔ اپنے قوانین پر نظرِ ثانی کرو۔ قانونی کتب کو نئے سر سے مرتب کرو۔ زندانوں کو از سرِ نو تعمیر کرو۔ عدالتوں میں نئے ججوں کا تقرر عمل میں لاؤ۔ قوانین کو عصرِ حاضر کے مطابق بناؤ۔

آپ لوگوں کے پیشِ نظر کفایت شعاری ہے۔ مگر خدا را اس کی خاطر تمہیں لوگوں کے سروں کو اس بیدردی سے ان کے تنوں سے جدا نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر تم فی الحقیقت سختی پر تلے ہوئے ہو۔ تو جلاد پر سختی کرو۔ اسی مشاہرہ پر جو تم اپنے ۸۰ جلادوں کو دیتے ہو تم چھ سو مدرس قائم کر سکتے ہو۔ جو ان جھوٹے والے مجرموں کے اذہان کی اصلاح کریں۔

کیا تم نے کبھی اس امر پر بھی غور و پرداخت کی ہے۔ کہ تمہارے ملک فرانس میں تعلیم یافتہ شخصوں کے کیا اعداد و شمار ہیں۔ یورپ کے چپہ چپہ پر علم کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں قریباً تمام افراد تعلیم یافتہ ہیں۔ بلجیم میں ہر شخص پڑھا ہوا ہے۔ تمام یونان تعلیم یافتہ افراد سے بھرا ہوا ہے۔ اگر علم سے بے بہرہ ہے تو تمہارا فرانس کیا یہ امر تمہارے لئے باعثِ شرم نہیں۔

زندانوں میں جاؤ۔ مجرموں کا بغور مطالعہ کرو۔ تمہیں اپنے رد کئے ہوئے شخصوں میں کئی ایسی شخصیتیں نہاں نظر آئیں گی۔ جو تھوڑی سی تعلیم حاصل کرنے پر تمہارے ملک کے درخشاں ستارے بن سکتیں۔ مگر ان کی موجودہ حالت حیوانوں سے

بدتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ قدرت بھی قابل الزام ہے۔ مگر تعلیم کی کمی کا ان اذہان کو آغوش جرم کی طرف لے جانے میں بیش از بیش حصہ ہے۔

اس لئے تمہیں چاہئے۔ کہ ان اذہان کی تعلیم و تربیت کے لئے کوشش کرو ان بچوں کو جو عدم نگہداشت کی نذر ہو رہے ہیں۔ بینچو اور ان کو علم کے سایہ میں پرورش پاکر پھیلنے کا موقعہ دو۔

اقوام کی قابلیت کا اندازہ ان غیر معمولی افراد سے ہوتا ہے۔ جنہیں وہ پیدا کرتی ہیں۔ جب روم اور یونان جیسے ممالک تعلیم یافتہ ہو گئے۔ تو کیا تم اپنی مادرِ وطن کے فرزندوں کو علم سے مستفید نہیں کر سکتے؟

جب فرانس میں تعلیم عام ہو جائے۔ تب عوام کو اخلاقی بلندی تک لے جاؤ۔ عدم علمیت گمراہ کن تعلیم سے بہتر ہے۔ سنہ ۱۸۳۰ء کے پروانہ آزادی اور دیگر فرانسیسی کتب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی ایک اور کتاب ہے۔ جو بائیبل ہے۔

تم جمہور کے لئے جو چاہو کرو۔ ان کی اکثریت کا دامن مفلسی اور تباہی سے وابستہ رہے گا۔ ان کی زندگی کشمکش پیہم ان تھک محنت اور نوبت بہ فاقت سے مرکب ہے۔

ترازوئے عدل کی طرف دیکھو۔ تمام مصائب غرباء کے لئے اور تمام مسرتیں امراء کے لئے، دونوں پلڑے غیر مساوی ہیں۔ ترازوئے عدل کو دھوکا نہیں دینا چاہئے۔ اور نہ ہی حکومت کو اس دھوکا دہی میں مدد کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے غرباء کے مصائب میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔

تم عدل و انصاف کو کام میں لاؤ۔ تاکہ غرباء کو معلوم ہو جائے۔ کہ ان کے لئے نیلگوں آسمان کے نیچے نوٹی ہائے پناہ ہے ایک عرشی جنت ہے جس کی لطیف فضاؤں سے وہ بھی متمتع ہو سکتا ہے۔ اس کا مرتبہ بلند کرو۔ تاکہ

اسے بھی معلوم ہو۔ کہ امرا کی تعیش پسندی میں وہ بھی برابر کا شریک ہے۔
یہ مسیح کی تعلیم تھی۔ جو وآلفیر سے زیادہ علم رکھتے تھے۔

تب ان لوگوں کو جو یہاں کام کرتے ہیں۔ آئیندہ دنیا میں حصولِ اجر کی امید دلاؤ۔ وہ صبر اور شکر سے ایام زیست بسر کریں گے۔

پس دین کی اشاعت کرو۔ اس کی تعلیم کو ہر مقام پر پہنچاؤ۔ تاکہ لوگوں کی سیرت بہتر اور ارفع ہو سکے۔

عوام کے سروں میں سو دلئے خام کی بجائے تابناک جوہر موجود ہیں۔ انہیں نیکی کی طرف بلاؤ۔ اور پھر دیکھو۔ کہ ان کی خوابیدہ قوتیں کس طرح بیدار ہوتی ہیں۔

حالات کے ماتحت کلاوے کو قاتل بننا پڑا۔ اگر اس کی تربیت بہتر طریقوں سے کی جاتی۔ تو وہ اپنی ملت کا بہترین خادم ثابت ہوتا۔

ظلمت کدہ ضمیر منور کرو۔

عوام کی حالت بہتر بناؤ۔

انہیں تعلیم دو۔

ان کے اخلاق کی حفاظت کرو۔

پھر تمہیں ایسے انسانی سر کاٹنے کے لئے تیغ ستم کی ضرورت نہ ہوگی۔

سعادت حسن منٹو

منٹو نہ تو کسی کو شرم دلانا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور نہیں جا سکتے اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چھوا ہے، چکھا ہے اور اب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلاتا ہے، بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پرواہ نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

منٹو آدم کی جرأت گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری، وہ آدمِ خاکی ہے ــــ وہ وجود خاکی جس میں بنیادی گناہ۔ فساد قتل وخون وغیرہ کے باوجود۔ خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شیریں